اللہ تعالیٰ کے رحم اور فضل کے ساتھ

ماہنامہ

قندیلِ ادب

مدیر

رانا عبدالرزاق خان

rana_razzaq@hotmail.com

07886304637 & 02089449385

معاون مدیر و ڈیزائنر:

عامر امیر

07903126126

majeedamer20@yahoo.com

نگران ویب سائٹ:

ایاز احمد راٹھور

www.bazmesherosukhan.co.uk

فہرست مضامین

نعتؐ۔ثاقب زیروی

نظم۔سیدنواب مبارکہ بیگم صاحبہ

رپورٹ مشاعرہ ٹوٹنگ

غزلیات۔

احمد فراز، رشید جعفری، جونا یلیاء، نقاد، بخشلائلپوری، جواد عالم، نورالجمیل نجمی،، بسم اللہ کلیم،، عبدالجلیل عباد، عقیل اظہر،، عدیم ہاشمی، ثمینہ راجہ، پروین شاکر، ساحر لدھیانوی، قتیل شفائی، منیر نیازی، احمد فراز،، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، سیف الدین سیف ، پروین شاکر، شاہدہ حسن، فاطمہ حسن، سعداللہ شاہ، صائمہ علی،

نثر پارے

نقاد عامر امیر، قلندر مومند، سیمیںؔ برلاس کی کتاب پر تبصرے مختلف شعراء ادیب کے، غزل، ۔اسلام اور احترامِ میّت، عاصی صحرائی، محبت کا جغرافیہ، پرویز پروازی کا تبصرہ بخش لائلپوری پر، قائداعظم اور مشاہیرِ کرام، کاش ہم دُمدار ہوتے، ہنسنا منع ہے۔اردو شاعری پر ایک نظر۔بی اے رفیق۔مسلمان۔

وضاحت۔

قِندیلِ اَدب انٹرنیشنل کسی سیاسی سماجی مذہبی گروہ یا فرقے کا ترجمان نہیں یہ نسل یا فرقوں کے امتیاز سے بالاتر ہے یہ صرف ادب کی ترقی و ترویج کے لئے جاری کیا گیا ہے۔اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں قارئین کو آراء یا مضامین سے اختلاف کا حق حاصل ہے اور اس کے صفحات حاضر ہیں۔تحریر کے ساتھ اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور ارسال کریں یہ آپ کا اپنا میگزین ہے۔تبصرے۔پروفیسر اقبال احمد نجم صاحب فرماتے ہیں۔آپ کا انتخاب مضامین و اقتباسات بہت ہی دلچسپ ہے۔

ثاقبؔ زیروی

دنیا کو نہ محبوب نہ مطلوب ہوا ہوں
میں آپ ؐ کا ہوں آپؐ سے منسوب ہوا ہوں
کل تک مرے سائے سے لرز جاتا تھا سورج
آج اپنے ہی سائے سے مرعوب ہوا ہوں
کل تک مرا دامن تھا فرشتوں کی جبینیں
آج اپنی ہی نگاہوں میں معیوب ہوا ہوں
ہر رنگ میں پہچانتا ہوں اُن کی تجلّی
یوں ہوش میں رہتے ہوئے مجذوب ہوا ہوں
کس شہر میں ہیں ان کے تلطف کی ہوائیں
میں دیدہ حالات کا معتوب ہوا ہوں
توفیق بھی دے،ظرف بھی دے ،تابِ نظر بھی
کیوں اپنی تجلّی ہی سے محجوب ہوا ہوں
پھر میرے خیالوں کی مسیحائی کو آجا
میں دارِ خیالات پہ مصلوب ہوا ہوں
ہے عشق مجھے شاہدِ لولاکؐ سے ثاقبؔ
کیوں ظلمتِ ایام کو مرغوب ہوا ہوں

سیدہ نواب مبارکہ بیگم صاحبہ کی ایک نظم

ڈاکٹر سر محمد اقبال کی نظم ۔۔۔نشانِ حقیقت کی آرزو کے جواب میں

مجھے دیکھ طالبِ منتظر مجھے دیکھ شکلِ مجاز میں
جو خلوص دل کی رمق بھی ہے ترے ادعائے نیاز میں
ترے دل میں مرا ظہور ہے ترا سر ہی خود سر طور ہے
تری آنکھ میں مرا نور ہے مجھے کون کہتا ہے دور ہے
مجھے دیکھتا جو نہیں ہے تو یہ تری نظر کا قصور ہے
مجھے دیکھ طالبِ منتظر مجھے دیکھ شکل مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں تری جبینِ نیاز میں
مجھے دیکھ رفعتِ کوہ میں مجھے دیکھ پستی کاہ میں
مجھے دیکھ عجز فقیر میں مجھے دیکھ شوکتِ شاہ میں
نہ دکھائی دوں تو یہ فکر کر کہیں فرق ہو نہ نگاہ میں
مجھے دیکھ طالبِ منتظر مجھے دیکھ شکل مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں تری جبینِ نیاز میں
مجھے ڈھونڈ دل کی تڑپ میں تو مجھے دیکھ روئے نگار میں
کبھی بلبلوں کی صدا میں سن کبھی دیکھ گل کے نکھار میں

میری ایک شان خزاں میں ہے میری ایک شان بہار میں
مجھے دیکھ طالبِ منتظر مجھے دیکھ شکل مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں تری جبینِ نیاز میں
میرا نور شکلِ ہلال میں مرا حسن بدرِ کمال میں
کبھی دیکھ طرز جمال میں کبھی دیکھ شانِ جلال میں
رگِ جاں سے ہوں میں قریب تر ترا دل ہے کس کے خیال میں
مجھے دیکھ طالبِ منتظر مجھے دیکھ شکل مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں تری جبینِ نیاز میں

احمد فراز

کسی جانب سے بھی پرچم نہ لہو کا نکلا
اب کہ موسم میں بھی عالم وہی ہُو کا نکلا
دستِ قاتل سے کچھ امید شفا تھی، لیکن
نوکِ خنجر سے بھی کانٹا نہ گلو کا نکلا
عشق الزام لگاتا تھا ہوس پر کیا کیا
یہ منافق بھی ترے وصل کا بھوکا نکلا
جی نہیں چاہتا میخانے کو جائیں، جب سے
شیخ بھی بزم نشیں اہل سبو کا نکلا
دل کو ہم چھوڑ کے دنیا کی طرف آئے تھے
یہ شبستاں بھی اسی غالیہ مُو کا نکلا
ہم عبث سوزن و رشتہ لئے گلیوں میں پھرے
کسی دل میں نہ کوئی کام رفو کا نکلا
یارِ بے فیض سے کیوں ہم کو توقع تھی فرازؔ
جو نہ اپنا نہ ہمارا نہ عدو کا نکلا

رشید قیصرانی۔۔۔تیرا شہر اور میرا گاؤں

تیرا شہر صنوبر والا پوٹھوہار کا چہرا ہے
میرا کیکر والا گاؤں بھی تھل دامان کا سہرا ہے
تیرے شہر میں رقص کریں گل بوٹے سرد ہواؤں کے
دھوپ دھمال کا منظر کتنا دلکش میرے گاؤں میں
تیرے شہر کے بنگلوں میں ہیں قصے اُجلی کاروں کے
میرے گاؤں کی بیٹھک میں بھی چرچے گھوڑ سواروں کے
تیرے شہر میں گلشن گلشن میلے ماہ جمالوں کے
میرے گاؤں کے ٹیلوں میں بھی نقش کئی دل والوں کے
تیرے شہر کیا کیا باتیں ہیں اُجلا شہر جیالے لوگ
میرے گاؤں کی زینت ہیں کچھ اُچے شملوں والے لوگ
تیرے شہر کے لڑکے بالے نام کمائیں کھیلوں میں
میرے گاؤں کے گبھرو ڈالیں جھمر میلوں ٹھیلوں میں
تیرے شہر کے لالہ و گل بھی مانا من متوالے ہیں
میرے گاؤں کے پھوگ سنوار بھی یار بڑے دل والے ہیں
اپنے شہر سے لال گلابی پھول سجا کے لانا تم
میرے گاؤں میں نیلے پیلے پیلو چننے آنا تم

عطاء المجیب راشد

رضا تیری ہے جو مولیٰ بتا دے
مجھے اُس راہ پہ خود ہی چلا دے
کمر خم ہے مری بارِ گنہ سے
مرے اِس بوجھ کو تو ہی ہٹا دے
جو بَن پڑتا ہے مجھ سے کر رہا ہوں
مرے تھوڑے کو تُو زیادہ بنا دے
ہوں کب سے منتظر تیری ندا کا
نویدِ مغفرت مولیٰ سنا دے
وہ جن سے پوچھ کچھ ہو گی نہ کوئی
مقدر میرا بھی ایسا بنا دے
ترے لائق نہیں دامن میں کچھ بھی
کوئی قابل گھڑ، اپنی عطا دے
تھکا ہار مسافر ہے یہ راشدؔ
درِ جنت اسے خود ہی دکھا دے۔

بزمِ شعروسخن برطانیہ

رپورٹ مشاعرہ ٹوٹنگ ۸ جون ۲۰۱۳ء

آج مورخہ ۸ جون بروز ہفتہ کو بزمِ شعروسخن برطانیہ کے زیرِ انتظام ٹوٹنگ لندن میں ایک مشاعرے کا انتظام تھا جس کے منتظم رانا عبدالرزاق خاں تھے۔ مشاعرہ ٹھیک ۷ بجے ڈیپائنڈ ہال میں شروع ہوا۔ ہال کو بینرز اور رنگ برنگ لائٹس سے سجایا گیا تھا۔ مشاعرہ کے صدرِ مجلس جناب آدم چغتائی شاعر برمنگھم تھے اور نظامت جناب مبارک صدیقی نے کی۔ تلاوت حسن خان نے کی اور نظم خالد چغتائی نے خوش الحانی سے پڑھی۔ پہلے داؤد قریشی کی کتاب ’’سرِ راہ چلتے چلتے‘‘ کی رسمِ رُونمائی بھی تھی۔ جس کے متعلق رانا عبدالرزاق خاں نے اسحاق ساجد کے کہے ہوئے الفاظ اس کتاب کے متعلق دہرائے۔ اور اس کے بعد داؤد قریشی نے اپنی شاعری اور اس کتاب کی تیاری

اور تکمیل کے مراحل سے سامعین کو آگاہ کیا۔ پھر مشاعرے کا آغاز ہوا۔

حسب قوائد پہلے کلام مبارک صدیقی نے پیش کیا۔ جو کہ بہت ہی جذباتی اور خوبصورت تھا جو کہ سامعین کے قلوب میں گھر کر گیا اور سامعین نے دل کھول کر داد دی۔ ان کے بعد نظامت رانا عبدالرزاق خاں کو سنبھال دی گئی۔ انھوں نے اپنا کلام پیش کیا۔

اپنی عقیدتوں کا نہ ہر گز شمار کر
دل سے مسیح و مہدی کے خلفاء سے پیار کر
تجھ کو گر ہے یقین کی منزل آرزو
دارورسن کی سمت نظر بار بار کر

بعد ازاں مقامی شعراء رمضان شائق، اشرف خاکی، عبدالمجید ظفر، رانا عطا اللہ نے اپنا اپنا کلام پیش کیا۔ جو کہ کچھ پنجابی میں بھی تھا اور مزاحیہ بھی تھا۔ دوسرے دور میں نظامت مبارک صدیقی نے سنبھال لی۔ جس میں بڑے بڑے جغادری شعراء نے اپنا کلام سنایا۔

مبارک صدیقی

دل کسی کے پیار میں سرشار تھا ایسا کہ بس
اور پھر وہ بھی گل و گلزار تھا ایسا کہ بس
پوچھتے ہو دوست کیا احوال وصلِ یار کا
ایک دریا دشت کے اُس پار تھا ایسا کہ بس

مبارک عارف۔

چن ہووے چودھویں دا بھاویں کالی رات ہووے
دل راضی تاں ہوند جے ماہی نال بات ہووے

عامر امیر نے رمزیہ کلام پیش کیا جو بہت سراہا گیا۔

پیار کی آگ لگا بیٹھے ہیں
آگ سے ہاتھ جلا بیٹھے ہیں
پیار میں غیرت، وضع ،شرائط
ہر دیوار گرا بیٹھے ہیں
خود کو سمجھانا ہے باقی
اس کو تو سمجھا بیٹھے ہیں
تو اور میں بس دو انساں ہیں
چاروں طرف خدا بیٹھے ہیں

ایوب اولیاء

نے پہلے تو ناظم غوری صاحب کی رحلت پر سب حاضرین سے افسوس کیا اور بڑے ہی اچھے الفاظ میں ان کا ذکر خیر کیا۔

اس ہستی ء معدوم کا کیا ہے یہ رہے نہ رہے
شعرو مفہوم کا کیا ہے یہ رہے نہ رہے
اے دوست دل میں گردِ کدورت نہ چاہیئے
اچھے تو کیا بُروں سے بھی نفرت نہ چاہیئے

نورالجمیل نجمی

تھام لیتی ہے مجھے تن کے کھڑا کرتی ہے
تیری تصویر حال میرا عجب کرتی ہے

باسط کانپوری نے اپنے سریلے سُر سے محفل کو لُوٹ لیا۔

اندھیری راتوں میں خواب بن کر کوئی جو آیا تو کیا کرو گے
لجا کے دیکھو آئینے میں جب اپنا چہرہ تو کیا کرو گے
ہوا میں خوشبو اور چاندنی رات بچھی ہے پھولوں کی سیج لیکن
کیا تھا آنے کا جس نے وعدہ وہی نہ آیا تو کیا کرو گے
تمہاری غزلیں تو آئینہ ہیں تمہارے دل کی رفاقتوں کا
سنا کے شعروں کو اپنے باسط ہوئے جو رسوا تو کیا کرو گے

بسم اللہ کلیم

کیوں دکھوں کی کھیتیوں میں اشک تم بوتے رہے
دور کی خوشیوں کی خاطر عمر بھر روتے رہے
کیا غضب کرتے رہے انسان جی سوچا ہے کیا
مشت بھر مٹی کے بدلے زندگی ڈھوتے رہے

ہارون الرشید۔۔ ہارون الرشید نے اپنا کلام ترنم سے سنایا جو بہت ہی پسند کیا گیا۔

دل سے ہر نقشِ تمنا کو مٹا کر دیکھیں
زندگی سادہ اُصولوں سے سجا کر دیکھیں
کاغذی پھول رہیں گے یہ سدا کاغذی پھول
آپ ان کو کسی صورت بھی سجا کر دیکھیں
ڈر ہے تنہا کو نہ رُسوا یہ زمانہ کردے

آپ اس طرح نگاہیں نہ ملا کر دیکھیں

داؤد قریشی

جلا کے دیپ میرے دل میں اپنی یادوں کے
قریب یوں میرے شام و سحر میں رہتا ہے

آدم چغتائی شاعرِ مترنم نے سامعین اور شعراء سے خوب داد لی

تیرے نصیب میں جو خدا اختیار دے
باقی کی عمر در پہ اُسی کے گزار دے
تیرے ہی غم میں ڈوبے رہے ہم تو عمر بھر
اس سے زیادہ گردشِ پیہم نہ دے مجھے

سیمی غزل برلاس تو اپنے معنی خیز کلام سے محفل پر چھا گئیں۔

میری آنکھوں میں تیرا عکس نہیں تُو ہوگا
جیسے ویرانے میں ماہتاب لبِ جُو ہوگا
بھیگی آنکھوں میں کوئی عکس کہاں ٹھہرے گا
بھیگی آنکھوں میں تو ٹھہرا ہوا آنسو ہو گا

آخر پر سب حاضرین کی خدمت میں پُر تکلف کھانا پیش کیا گیا۔ اور یہ پروگرام رات ساڑھے گیارہ بجے ختم ہوا۔ سب لوگ اس شام سے بہت محظوظ ہوئے اور سب نے انتظامیہ اور شعراء کا خصوصاً رانا عبدالرزاق خاں کو ایسی مجالس منعقد کرنے پر بہت ہی خراج تحسین پیش کیا۔ اللہ تعالیٰ سب کو خوش رکھے۔

اُردو شاعری پر ایک نظر

محترم خان بشیر احمد رفیق

جذبات کے ایسے رنگ بیان کرنے کا نام شاعری ہے کہ پڑھنے اور سننے والے پر وہی اثرات مُرتب ہو جائیں جو شاعر پر چھا گئے تھے۔ یا جس اثر سے ہمیں وہ متاثر کرنا چاہتا ہے۔ مثلاً حسن، عشق، حزن وانبساط، غم ورنج، عفو وغضب، یا قدرتی مناظر دیکھ کر بہار اور خزاں گرمی اور سردی،، دشت ودریا کی تصاویر ایسے پیرایہ میں کھینچنا کہ پڑھنے یا سُننے والے کی آنکھوں کے سامنے وہی مناظر گھومنے لگیں۔ اس منظر کشی کو شاعری کہتے ہیں۔

مولانا شبلی اپنی کتاب ''شعرالعجم'' حصہ چہارم کے صفحہ ۸۹ پر لکھتے ہیں کہ:۔

''شاعری صرف محسوسات کی تصویر نہیں کھینچتی بلکہ جذبات اور احساسات کو بھی پیش نظر کر دیتی ہے۔ اکثر ہم خود اپنے نازک اور پوشیدہ جذبات اور احساسات سے واقف نہیں ہوتے۔ یا ہوتے ہیں تو ایک دُھندلا دُھندلا سا نقش نظر آتا ہے۔ شاعری پسِ پردہ چیزوں کو پیش نظر کر دیتی ہے۔ دُھندلی چیز چمک اُٹھتی ہے مٹا ہوا نقش اُجاگر ہو جاتا ہے۔ کھوئی ہوئی چیز ہاتھ آجاتی ہے۔ خود ہماری روحانی تصویر جو کسی آئینہ کے ذریعے ہم نہیں دیکھ سکتے شعر ہم کو دکھا دیتا ہے''۔ غرض شاعری جذبات کے بیان کرنے کا دوسرا نام ہے۔ شاعری کے متعلق بہت سے لوگوں نے یہ لکھا ہے کہ یہ تضیع اوقات کے سوا کچھ بھی نہیں اُن کے نزدیک شاعر قوم کا ایک ناکارہ وجود ہے۔ اور بجائے قوم کو فائدہ پہنچانے کے نقصان پہنچاتا ہے۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ شعر گوئی اکتسابی علم نہیں ہے۔ بلکہ یہ جوہر قدرت جسے ودیعت فرمائے وہی شاعر بنتا ہے اگر جبلّی موزونیٔ طبع نہ ہو تو بہ ہزار تبحر علمی کوئی شخص شاعر نہیں بن سکتا پس ثابت ہوا کہ شاعری قدرت کا ایک عطا کردہ جوہر ہے اور قدرت کی عطا بیکار نہیں ہوتی۔ البتہ اس سعادت کا ناجائز مصرف بسا اوقات ادبار کا باعث ہو جاتا ہے۔ اور بیان کی مبالغہ آرائی سے قوموں کے اذہان میں انحطاط پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن اس شاعری کا دوسرا اور درخشندہ پہلو بھی آپ کے سامنے ہے۔ جبکہ صرف شاعر کا کلام قوموں کو بیدار کر دیتا ہے۔ مثلاً ایڈورڈ بادشاہِ انگلستان نے جب ویلز پر چڑھائی کی تو ویلز کے لوگ سخت گھبرا گئے۔ وہ ہمت ہار بیٹھے لیکن اُن کے شعراء نے اہلِ ویلز کی غیرت کو اُبھارنے کے لئے ایسے ایسے ولولہ انگیز اشعار کہے کہ وہ مقابلہ پر ڈٹ گئے اور انتہائی اضطراب اور سراسیمگی کی حالت میں بھی اطاعت قبول کرنے کے لئے تیار ہوئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایڈورڈ کی فوج کو سخت نقصان پہنچا گو بسد میں ویلز کی فتح کے بعد ایڈورڈ نے ان تمام شعراء کو قتل کروا دیا۔ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ شاعری اکثر اقوام کے لئے رحمت ثابت ہوئی ہے۔ اس نے خوابیدہ اقوام کو بیدار کیا ہے القصّہ یہ کہنا کہ شاعری ہماری سوسائٹی کے لئے مفید نہیں سراسر زیادتی ہے۔ اس تمہید کے بعد میں اصل مضمون کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ تاکہ شاعری کی مختلف اقسام پر روشنی پڑ سکے:۔ اردو شاعری کے لئے ردیف و قافیہ کا استعمال ضروری قرار دیا گیا ہے۔ (اگرچہ آج کل چند جدّت پسند اس خیال کو تسلیم نہیں کرتے)۔ غزل:۔ غزل میں عام طور پر حُسن وعشق کے جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ مگر بعض شعراء نے اسے تصوّف کا رنگ بھی دیا ہے۔

غزل کے لفظی معنی ہیں ''عورتوں سے خطاب'' اس کی ابتدا ایران سے ہوتی ہے اس کا ہر شعر الگ خیال کا حامل ہوتا ہے۔ غزل کے اشعار عام طور پر پانچ سے گیارہ تک ہوتے ہیں۔ غزل اُردو شاعری کی جان ہے اُردو جاننے والا بوڑھا، بچہ، جوان، عورت اور مرد سبھی غزل کے مداح ہیں ہر موقع پر غزل پڑھی اور سنی جاتی ہے۔ قصیدہ:۔ وہ نظم کو کسی کی مدح یا ہجو میں ہو قصیدہ کہلاتی ہے اس کے اشعار کی تعداد عموماً پچیس اور زیادہ سے زیادہ ایک سو ستر تک ہوتی ہے۔ قطعہ:۔ قطعہ کے معنی ٹکڑے کے ہیں۔ اس کے اشعار کی تعداد کم از کم دو اور زیادہ سے زیادہ جتنے بھی ہوں اس میں قافیہ کی پابندی لازمی نہیں۔ رُباعی:۔ رُباعی میں عام طور پر دو شعر ہوتے ہیں پہلا، دوسرا اور چوتھا

مصرعہ ہم قافیہ ہوتے ہیں اس میں آپ ہر قسم کا مضمون بیان کر سکتے ہیں۔**مثنوی**:۔جذباتِ انسانی،مناظرِ قُدرت،واقعہ نگاری،تخیّل،ان تمام قسم کے خیالات کو بیان کرنے کے لئے مثنوی ہے۔مثنوی اُردو نظم کی سب سے اچھی صورت ہے۔کیونکہ اس میں آپ ہر خیال کو بیان کر سکتے ہیں۔عام طور پر اس میں کوئی تاریخی واقعہ یا قصہ بیان کیا جاتا ہے اور اس میں ردیف کی کوئی قید نہیں ہوتی۔**واسوخت**:۔جس میں عاشق اپنے معشوق کی بے وفائی کا تذکرہ کرتا ہے ۔**تاریخ**:۔جس میں شاعر کسی واقعہ کی تاریخ حروف ابجد کے حساب سے نکالتا ہے ۔**مرثیہ**:۔کسی مرے ہوئے شخص کے اوصاف بیان کرنے کا نام "مرثیہ" ہے مرثیہ میں نہ صرف مردہ لوگوں کی توصیف بیان کی جاتی ہے بلکہ صبح و شام کا سماں، جنگ کی گرمی، مَردوں کی آہ و بُکا کا بھی صحیح نقشہ کھینچا جاتا ہے۔مرثیہ کی ابتدا عرب سے ہوئی۔عرب شعراء نہایت موثر انداز میں مراثی لکھا کرتے تھے۔اُردو شاعری میں مرثیہ نہایت قدیم صنف ہے۔مولانا شبلیؒ کے نزدیک مرثیہ کی ابتداء سوداؔ و میرؔ سے پہلے ہو چکی تھی۔مرثیے پہلے سوز و گداز کے لہجے میں پڑھے جاتے تھے۔لیکن آج کل تحت اللفظ پڑھنے کا بھی رواج ہو چکا ہے۔اُردو مرثیہ کو کمال تک پہنچانے والے شعراء یہ ہیں۔میر ضمیرؔ، میر انیسؔ، میرزا دبیرؔ، میر ضاحکؔ وغیرہ۔

ساغر صدیقی

نہ خوفِ خدا ہے نہ خوفِ خدائی
بشر دے رہا ہے بشر کی دُہائی
نہ جانے کہاں کھو گئی ہے مروّت
بڑی دُور تک تو مرے ساتھ آئی
نگاہوں کے انداز بدلے گئے ہیں
وہی ہے مگر رسمِ جلوہ نمائی
کسی کے مہکتے ہوئے گیسوؤں سے
شگوفوں نے سیکھی ہے شعلہ نوائی
فضائے مقدر بدل دی ہے ساغرؔ
نظر جب کبھی زندگی سے ملائی

ناصر کاظمی

دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا
وہ تری یاد تھی اب یاد آیا
آج مشکل تھا سنبھلنا اے دوست
تو مصیبت میں عجب یاد آیا
دن گزارا تھا بڑی مشکل میں
پھر ترا وعدہِ شب یاد آیا
تیرا بھولا ہوا پیمانِ وفا
مر رہیں گے اگر اب یاد آیا
حالِ دل ہم بھی سناتے لیکن
جب وہ رُخصت ہوا تب یاد آیا
بیٹھ کر سایہِ گل میں ناصرؔ
ہم بہت روئے وہ جب یاد آیا

ادا جعفری

کہتے ہیں کہ اب ہم سے خطاکار بہت ہیں
اک رسمِ وفا تھی سو وفادار بہت ہیں
لہجے کی کھنک ہو کہ نگاہوں کی صداقت
یوسف کے لئے مصر کے بازار بہت ہیں
کچھ زخم کہ رنگتِ گلِ تر کے قریں تھے
کچھ نقش کہ ہیں نقش بہ دیوار بہت ہیں
کیوں اہلِ وفا زحمتِ بیدار نگاہی
جینے کے لئے اور بھی آزار بہت ہیں
ہر جذبہ بے تاب کے احکام ہزاروں
ہر لمحہ بے خواب کے اصرار بہت ہیں
پلکوں تک آ پہنچے نہ کرنوں کی تمازت
اب تک تو اداؔ آئینہ بردار بہت ہیں

جون ایلیا

تمہاری یاد سے جب ہم گزرنے لگتے ہیں
جو کوئی کام نہ ہو بس وہ کرنے لگتے ہیں
تمہارے آئینہ ذات کے تصور میں
ہم اپنے آئینے آگے سنورنے لگتے ہیں
تمہارے کوچہ جاں بخش کے قلندر بھی
عجیب لوگ ہیں ہر لمحہ مرنے لگتے ہیں
ہم اپنے حالتِ بے حالیء اذیت میں
نہ جانے کس کو، کسے یاد کرنے لگتے ہیں
بہت اداس ہوں میں غم سدا نہیں رہتا
بہت اداس ہوں میں زخم بھرنے لگتے ہیں
یہاں میں ذکر نہیں کر رہا مکینوں کا
کبھی کبھی در و دیوار مرنے لگتے ہیں

نقاد...ایک رُوپ

عامر امیر

شاعر اور افسانہ نگار کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔کوئی شاعر کسی دوسرے شاعر کو اپنے سے تو بڑا تو بڑی بات ہے اپنے برابر بھی تسلیم کرنے کو بھی تیار نہیں ہوتا۔اسی طرح کوئی افسانہ نگار اس مفروضہ کو گوارا نہیں کرتا۔اسے سب سے اچھا تسلیم نہ کیا جائے۔کرشن چندر نے جب مذاق مذاق میں ہی افسانہ کی قلمرو میں اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کیا تو سعادت حسن منٹو نے ایک لمحہ وتوقف کے بغیر ہی اپنے شہنشاہ ہونے کی منادی کرادی تھی۔یگانہ نے شہنشاہ سے بھی بڑھ کر غالب تک کو نہیں بخشا تھا۔لیکن شاعر یا افسانہ نگار اگر کسی کو خاطر میں لاتا ہے تو وہ نقاد ہے۔نقاد ایک ایسا قلندر ہے جس کے سامنے بندر بھی ناچتا ہے۔نقاد تو نقاد، نقاد کے بچے کو بھی اہمیت دینا، شاعر، افسانہ نگار یا دوسرا قلمکار اپنے فرائض منصبی میں داخل سمجھتا ہے۔نقاد کے بچے سے مراد وہ بچہ بھی ہوسکتا ہے جسے غصے میں نقاد کا بچہ کہا جاتا ہے۔مطلب یہ ہے کہ نقاد کو باپ دادا سمجھنا کتنا ہی برا کیوں نہ لگے مصلحت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ سگ لیلیٰ سے پیار کیا جائے۔اور قلمکار کے لئے نام اور شہرت سے زیادہ محبوب لیلیٰ اور کون ہوسکتی ہے۔؟ ویسے بھی اگر نقاد کا بچہ یعنی فرزند ارجمند اگر سامنے آجائے تو اسے سلام کرلیا جائے تاکہ یہ سلام ایک نسل سے دوسری نسل تک یعنی لڑکے سے اس کے باپ تک منتقل ہوجائے۔کیونکہ ہر بچہ باپ بھی ہوتا ہے اس لئے باپ کو باپ ماننے میں کیا قباحت ہے۔فلمسٹار اور لیڈر جو ہمیشہ اپنے چمچوں میں گھرے رہتے ہیں۔کسی سے آنکھ ملانے سے اس طرح بچنے کی کوشش کرتے ہیں جیسے آنکھ ملی اور عزت گئی۔جیسے آنکھ کا ملانا نہ ہوا اپنے آپ کو کسی کی نظروں سے گرالینا ہوا۔۔چنانچہ فلمسٹار اور لیڈر کے قدم زمین پر نہیں ٹکتے۔لیکن فلمسٹار اور لیڈر بھی جرنلسٹوں کو دیکھ کر اپنی ساری اکڑفوں بھول جاتے ہیں۔کیونکہ جرنلسٹ میں بھی ایک نقاد سمایا ہوتا ہے۔اور جرنلسٹ کا رول بھی نقاد کے رول سے مختلف نہیں ہوتا۔جرنلسٹ سے بھی نام ملتا ہے شہرت ہوتی ہے عیب ڈھانکے جاتے ہیں اور اس بات سے کون انکار کرسکتا ہے کہ لیلائے شہرت کے آگے حقیقی لیلیٰ ہیچ ہوتی ہے۔صاف ظاہر ہے کہ جرنلسٹ یا نقاد سے جہاں نام اور شہرت ملتی ہے۔نام اور شہرت کو گہن بھی لگ سکتا ہے۔نیک نامی کی بجائے ذلت بھی مل سکتی ہے۔بات نقاد کی چل رہی ہے۔درمیان میں جرنلسٹ کہاں سے آگیا۔؟ جرنلسٹ کہیں سے بھی وارد ہوسکتا ہے۔یہاں وہ نقاد بن کر مسلط ہوا ہے۔لیکن اگر بات اردو کے نقاد تک ہی محدود رکھی جائے۔تو بات زیادہ آگے نہیں بڑھے گی۔نقاد اور نقد میں بہت تھوڑا فرق ہے۔نقاد نقد سے سوا ہے۔اس کے درمیان میں اضافہ ہے۔اس لئے نقاد کا معاملہ نقد ہوا کرتا ہے۔یہی خوب سودا نقد ہے۔اس ہاتھ لے اُس ہاتھ دے۔چھوٹے سے چھوٹا بلکہ ادیبوں کی فہرست کا آخری ادیب بھی اگر نقاد سے جھک کر ملے سلام کرے۔اس کی پسند اور مجاز کے مطابق خاطر تواضع کا خیال رکھے اور اس کے ناز نخرے سہے تو فہرست مذکور کا آخری یعنی ادیب کا ادنیٰ ترین نام ہونے کے باوجود ادب کا آخری مغل ہونے کی سند نقاد سے حاصل کرسکتا ہے۔سند ہی نہیں بلکہ توصیف نامہ بھی اپنی کتاب کے مقدمہ پیش لفظ یا دیباچہ کی شکل میں یا کسی اور عنوان سے نقاد سے لکھوا سکتا ہے۔اگر کتاب شائع ہوچکی ہو تو تبصرہ لکھوا کر یا کسی تقریب میں مضمون پڑھنے کے لئے کسی نقاد کو آمادہ کرکے اس سے سند توصیف حاصل کرسکتا ہے۔اس کے برخلاف اگر نقاد کسی کو پاتال میں پہنچانا چاہے تو اسے جوش بھی ٹھنڈا اور جگر بھی بے جگر دکھائی دیتا ہے۔کرشن چندر کو اس کی نظر میں قلم پکڑنا ہی نہیں آتا۔غرض یہ کہ کوئی اس کی نظر میں نہیں سماتا۔حتیٰ کہ میرؔ اور غالبؔ بھی اس لئے نقاد سے بگاڑ مول لے کر کوئی ادیب اپنی عاقبت خراب کرنا نہ چاہے گا۔اچھا یہ بھی مان لیتے ہیں کہ نقاد نہ کچھ لکھے گا نہ کہیں کچھ کہے گا، نام تک زبان پر نہیں لائے گا لیکن اس کا خاموش رہنا بھی تو بہت بڑا کرم ہوتا ہے۔یہ بھی کیا کم ہے کہ وہ خاموش رہے نقاد کو خاموش رکھنے کے لئے بھی کیا کیا جتن نہیں کئے جاتے۔اس کے قلم کو روکنے کے لئے ہر طرح کی پیش بندی کی جاتی ہے۔اس لئے کس میں یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت ہے کہ استادوں کے استاد یعنی نقاد سے پُرخاش مول لے.....کیونکہ استادوں کے استاد کے سامنے استاد شہ بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔وہ بے چارہ تو شہ کا مصاحب بن کر اِتراتا پھرتا ہے۔اور یہ استادوں کے استاد اپنے آگے پیچھے ''آزو بازو'' اوپر نیچے ہمیشہ ہر طرف مصاحبین ادب کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔☆

بخش لائلپوری

منزلوں نے سوچا ہے فاصلوں نے دیکھا ہے
حشر کاروانوں کا راستوں نے دیکھا ہے
حق پرست دنیا میں روز سُولی چڑھتے ہیں
فائلوں میں لکھا ہے منصفوں نے دیکھا ہے
ساری دنیا جانے ہے نقشہ گھر کے باہر کا
آنگنوں کا پس منظر روزنوں نے دیکھا ہے
ناخدا سے کیا پوچھیں ناخدا کو کیا معلوم
ڈوبتے سفینوں کو پانیوں نے دیکھا ہے
قاتلوں کے ہاتھوں کو پھانسیوں کے پھندوں کو
گردنوں نے ناپا ہے مقتلوں نے دیکھا ہے
بارشوں کی باتیں تو مصلحت کی باتیں ہیں
پیاس کی زمینوں کو بادلوں نے دیکھا ہے
بخشؔ کون پڑھتا ہے تیری سچی تحریریں
جو قلم نے لکھا ہے کاغذوں نے دیکھا ہے

جواد عالم

دن کو دن کہتے ہیں رات نہیں لکھتے
ہم دیوانوں جیسی بات نہیں لکھتے

جس کا جب دل چاہے وہ مل سکتا ہے
دروازے پہ ہم اوقات نہیں لکھتے
یاد کے جنگل کا ہر پیڑ سنہرا ہے
یاد کو مٹی کے ذرات نہیں لکھتے
غارت ہو گئے غم کے کاروبار جوادؔ
اب آنکھوں میں برسات نہیں لکھتے

کاش ہم دُمدار ہوتے؟

طنز و مزاح ..... عاصی صحرائی

صاحبو! کبھی آپ نے خود میں کوئی کمی محسوس کی ہے۔؟ کوئی ایسی چیز جو ہر ''حیوان'' کے پاس ہے مگر اشرف المخلوقات اس سے محروم ہے۔ اگر کمی محسوس کی ہے تو شکر کریں کہ آپ کے حواسِ خمسہ صحیح کام کر رہے ہیں۔ اور اگر نہیں تو فکر کریں کہ اس عظیم محرومی کا آپ کو احساس تک ہونے نہیں دیتی.....وائے افسوس! ذرا سوچیں تو وہ کیا چیز ہے۔؟ وہ ہے ''دُم'' تمام چرند پرند اس نعمت سے مستفید ہو رہے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک ستارے نے بھی دُم لگا لی۔ تو آخر انسان نے کیا قصور کیا ہے۔ کہ وہ اس عظیم نعمت سے کیوں محروم ہے۔ بس اسی احساس سے ہمیں احساسِ کمتری ہونے لگتا ہے۔ دل ڈوبنے اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگتا ہے۔ کہ آخر ہم اس معاملے میں دنیا میں جانوروں سے پیچھے کیوں رہ گئے۔....؟ حالانکہ بہت سے معاملات میں ہم نے تو انہیں بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ مثلاً جب کسی درندے کو بھوک لگتی ہے تو وہ کسی غیر جنس کو مار کر اپنا پیٹ بھر لیتا ہے۔ ورنہ چہل قدمی اور قیلولہ فرماتا ہے۔ لیکن حضرت انسان کے اندر شکم سیری کے ساتھ ہی اپنے ہم جنسوں کی نسل کشی کی خواہش بڑھتی جاتی ہے۔ (خواہ نسل کشی معاشی ذہنی یا جسمانی ہی کیوں نہ ہو) اسی طرح حیوانات تو ایک دوسروں کی حدود کا خیال رکھتے ہیں۔ کوئی شیر کسی دوسرے شیر کے علاقے میں مداخلت کا حق (مذہب، قوم اور ملک کے احساس برتری کے زعم میں) ناجائز سمجھتا ہے۔ (یعنی پاکستانی قوم کو) یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس دوڑ میں ہم کسی سے پیچھے نہیں۔ جانوروں کی طرح رشتوں پہچان معدوم ہو گئی ہے۔ اول خویش کی بیماری ہر جانور سے بڑھ کر ہے، جانوروں کی طرح مذہب سے بیگانگی اور شکم پُری کے چکر میں انسان رہتا ہے۔ کسی چیز کی کمی پڑ جائے تو یہی انسان چھینا جھپٹی میں ایک دوسرے سے سبقت لے جاتا ہے۔ صبر و قناعت نام کو نہیں۔ نظم ضبط نعرے کی حد تک تو ہے مگر کہیں بھی لائن میں لگنا پڑ جائے تو موت پڑنے لگتی ہے۔ ناجائز طریقے سے اپنی باری کو مقدم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جیسے کتے ہڈی کے لئے لڑتے ہیں اسی طرح رزق حرام کے لئے انسان کوشاں رہتا ہے۔ اور ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے لئے ناجائز طریقوں سے دولت کمانے کے لئے سرگرداں رہتا ہے۔ جس طرح جانور حب الوطنی کے جذبے سے عاری ہوتے ہیں یہی حال اب حضرتِ انسان کا بھی ہے۔ جس طرح جانور بے پیر بے مرشد ہوتے ہیں اس سے بدتر حال اس کا ہے۔ انسان بلکہ کئی منفرد اعزازات کے حامل ہی ہیں۔ مثلاً ہماری اسمبلیوں کے گھوڑے سب سے زیادہ بولی لگانے والے خریداروں کے ہاتھوں دن رات تخصیص کے بغیر وقتاً فوقتاً فروخت ہوتے رہتے ہیں۔ اسی طرح بندہ خواہ مخواہ نقالی میں ہی بدنام ہے۔ نقالی میں تو ہم اس کے بھی استاد ہیں۔ یقین نہ آئے تو ٹی وی کا کوئی بھی چینل آپ دیکھ لیں مغرب کی نقل میں بے ہنگم اچھل کود کرنے والی نوجوان نسل میں کہیں بھی مشرق اور اسلامی رنگ کی جھلک تک نظر نہیں آئے گی۔ اور نوجوان نسل ہی کو کیوں موردِ الزام ٹھہرائیں سربراہانِ مملکت سے لیکر عام آدمی تک ہر شخص نقالی کے مختلف کمالات دکھا رہا ہے کہ مغربی اقوام نے بھی کچھ میدانوں میں ان کا ساتھ دیا ہے مثلاً مغربی ساحلوں پر ہی دیکھ لیں اگر حیوانوں میں کپڑے پہننے اور دیگر تکلفات کا فیشن نہیں تو انسان بھی ان سے پیچھے نظر نہیں آتا بلکہ.....! غرض حیوانوں میں انسانیت اور انسانوں میں حیوانیت کچھ اس طرح نظر آتی ہے کہ اگر آج ڈارون زندہ ہوتا تو اس کے لئے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہوتا کہ کون کس کا جدامجد ہے۔ گویا کہ یہ ثابت ہوا کہ سوائے دُم کے حیوانیت کے ہر میدان میں انسان سب حیوانوں کو ہرا کر وکٹری اسٹینڈ پر سب سے اونچا کھڑا ہے۔.....! دُم کے حوالہ سے زیادہ حیرت ہمیں ''روشن خیال'' لوگوں پر ہے جو ترقی اور جدت کی جہت اپنانے میں دیر نہیں کرتے۔ تو پھر آخر ابھی تک دُم فیشن میں کیوں نہیں آئی۔ کچھ جینٹنگ انجینیر نگ کے ماہرین کو ہی انسان کے ڈی این اے میں کچھ ردو بدل کر کے دُمدار انسان تخلیق کرنا چاہیئے تھے اس سے فائدہ ہی ہوتا۔ سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہوتا کہ انسانیت کے حوالے سے انسان سے جو خواہ مخواہ کی توقعات وابستہ کر لی گئی ہیں ان سے پرہیز کر لیا جاتا۔ کیونکہ دُم کی عدم موجودگی کے باوجود اسکی جبلت تو وہی ہے کہ ایک خواہ مخواہ کی منافقت ہی کرنی پڑتی ہے بلکہ بعض انسانوں کی عامیانہ اور شوقیانہ، باغیانہ حرکتوں پر ہمیں تو یہ شبہ ہوتا ہے کہ صف انسان میں شامل ہونے کے لئے انہوں نے دُم جھڑوا دی ہے۔ (اسی لئے ذرا ذرا سی باتوں پر بھڑک بھی اُٹھتے ہیں کہ گویا کسی نے ان کی دُم پر پاؤں رکھ دیا) اسی طرح بعض انسان کم از کم پندرہ سال تک نلکی میں رکھے جانے کے قابل ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کے سیدھے ہونے کے لئے بارہ سال کم ہیں۔ اور بغیر دُم کی انسانی لومڑیوں سے تو آپ کا واسطہ پڑتا ہی رہتا ہوگا۔ جو ہماری سیاست میں بڑی بہتات سے ہیں۔ اور عوام کا بھیڑوں کی طرح آنکھیں بند کر کے ان سیاہ سی راہنماؤں کے پیچھے لگ جانے کا مشاہدہ بھی پچھلے ۶۵ سالوں سے ہر الیکشن میں ہو رہا ہے۔ دیکھیں بات کہاں سے وہیں پہنچ گئی۔ ہاں تو بات ہو رہی تھی دُم کے فوائد کی۔ تو مشرقی ساسوں کے لئے تو دُم (بہو) کی ایک نعمت ہوتی۔ کیونکہ بیچاریوں کو حسرت ہی رہتی ہے کہ بہو کی چوٹی مروڑ دیں (بہو کے بال جواب کٹے ہوتے ہیں) تو چلیں چوٹی نہ سہی دُم ہی سہی'' کچھ مروڑ کے دل کے ارمان تو نکالے جاتے اوروں کی دُمیں سلامت ہوتیں۔ کیونکہ دُم کو اپنے قریبی رشتہ دار بندر کی طرح ذرائع آمد و رفت

استعمال کرنے کیلئے درخت زیادہ سے زیادہ لگائے جاتے ۔جس سے ماحولیاتی آلودگی کا مسئلہ ہی نہ ہوتا طالب علموں کو بھی آسانی ہی ہوتی جب چاہا جوتے جھاڑ لیتے ۔کبھی سیٹ جھاڑ لیتے اور پوائنٹ سے لٹک کر جھولا جھولتے ہوئے گھر پہنچ جاتے ۔ کاسمیٹک اور جیولری بنانے والوں کو بھی ایک نیا میدان ہاتھ آجاتا اور کچھ نہیں تو لوگوں کو ایک نیا روزگار ہی میسر آتا ۔پولیس کے بارُعب افراد مونچھوں کی طرح دُم کو بھی اور لمبی بنانے کے نت نئے جتن کرتے ۔اور جرائم کی شرح بھی کم ہوجاتی کیونکہ بس دُم پکڑتے دیر ہوتی اور مجرم قابو میں.....! کاش کہ ہم دُمدار(انسان).....ہوتے.....کاش....کاش

نورالجمیل نجمی

ہو رہی ہے یہ گفتگو مجھ میں
کیوں پھرتا ہے بے وضو مجھ میں
اک طرف نور اک طرف ظلمت
جنگ جاری ہے چار سو مجھ میں
ایک مجذوب تیری یادوں کا
رقص کرتا ہے کُو بہ کُو مجھ میں
مِیل بہ مِیل دوڑتا جائے
کون ایسا ہے ثُند خو مجھ میں
دیکھ کر آنکھ محو حیرت ہوں
کون بھرتا ہے یہ صبو مجھ میں
نیم شب ایک ہٹ دھرم آنسو
ہوئے بیٹھا ہے قبلہ رُو مجھ میں
مثلِ خوشبو ہے سانس میں شامل
اب ٹھکانے لگا ہے تُو مجھ میں
پہلے بس ایک زخم چیخا تھا
ہوگیا شور ہی شروع مجھ میں
ہورہی ہے شکست سے دوچار
جیت جانے کی آرزو مجھ میں
نفس آکاس بیل ہے عجمی
جس سے ہوتی نہیں نمو مجھ میں

محبت کا جغرافیہ ۔۔۔ابن لطیف

دنیا میں اب تک جو مشہور لڑائیاں ہوئی ہیں ۔ان میں سے چند لڑائیاں ہمیں یاد ہیں۔سکندر اعظم اور راجہ پورس کی لڑائی، غازی صلاح الدین ایوبی اور رچرڈ شیر دل کی لڑائی ،فرانس اور برطانیہ، روس اور جرمنی کی لڑائی ، چین اور جاپان کی لڑائی ،پہلی اور دوسری عالمی لڑائی ،لیکن دنیا میں میاں بیوی کی لڑائی جتنی مشہور ہے۔۱۹۱۴ء کی لڑائی بھی اتنی مشہور نہیں، کیونکہ یہ لڑائی ازل سے جاری ہے ۔شاید ابد تک جاری رہے گی ۔اور کیا تعجب کہ جس وقت یہ سطور لکھ رہا ہوں دنیا کے لاکھوں کروڑوں گھروں میں خاوندوں اور بیویوں کے درمیان تُو تُو میں میں، لات گھونسہ، اُٹھا پٹخ ہورہی ہے ۔دنیا میں آج تک نہ پہلے کبھی کوئی ایسے میاں بیوی گزرے ہیں اور نہ آئندہ ایسے گزریں گے ۔جن کے درمیان کم ازکم ایک اور زیادہ سے زیادہ بارگالی گلوچ مارکٹائی نہ ہوئی نہ ہوگی ۔میں یہ نہیں کہتا کہ دنیا کے سارے میاں بیوی آپس میں پیار سے نہیں رہتے ۔میں تو یہ کہتا ہوں کہ یہاں میاں بیوی کی لڑائی بھی عجیب لڑائی ہوتی ہے ۔دل میں تو پیار مگر اوپر سے مار میاں بیوی ۔گویا ایک دوسرے سے لڑنے کے لئے ملتے ہیں ۔اور ملنے کے لئے لڑتے ہیں ۔اسی لئے تو تجربہ کار میاں بیوی کہتے ہیں ۔میاں بیوی کی لڑائی سے آپس میں محبت اور زیادہ بڑھتی ہے ۔اس کا تو آپ میں سے ہر میاں اور ہر بیوی کو ذاتی طور پر بھی تجربہ ہوگا ۔کہ لڑائی کے بعد پیار کیسے بڑھتا ہے اور یہ بھی جانتے ہیں کہ میاں بیوی کی لڑائی بھی اچھا خاصا ''کرکٹ میچ'' ہوتی ہے ۔جو بالعموم ہار جیت کا فیصلہ ہوئے بغیر ختم ہوجاتی ہے ۔لڑائی اور صلح کے بعد میاں بیوی سے پوچھیئے کہ بھئی لڑائی کس بات پر ہوئی تھی ۔اور صلح کیسے ہوئی ۔تو دونوں کو اپنے حافظوں پر زور دینا پڑتا ہے ۔میاں بیوی کی لڑائی میں تکلیف بالعموم میاں کو ہوتی ہے ۔بیوی مزے میں رہتی ہے ۔ہاں البتہ وہ بیویاں مستثنیٰ ہیں ۔جن کے میکے انڈیا میں رہ گئے ۔ایسی بے چاری بیویوں کی شوہر سے لڑائی ہو تو تکلیف بیوی کو ہوتی ہے ۔اور میاں مزے میں رہتا ہے ۔یعنی بیوی نے سالن میں مرچیں زیادہ ڈال دیں ۔تو بس پھر شوہر کے مرچیں لگ گئیں اور اس نے بیوی کو مار مار کر کوفتہ بنا دیا ۔اب بے چاری بیوی ویزہ سسٹم کو کوسنے لگ جاتی ہے ۔کھانا نہیں پکاتی روتی ہے اور دل کو جلاتی ہے ۔ادھر بیوی دُکھ سہتی ہے ۔ادھر میاں بڑے ٹھاٹھ سے ہوٹل میں فرائی انڈے کھاتا ہے ۔لیکن جو بیوی مہاجرہ نہیں ہیں ان سے اگر شوہروں کی لڑائی ہوجائے ۔تو بیویوں کا کچھ نہیں بگڑتا ۔البتہ شوہر کا حلیہ ضرور بگڑ جاتا ہے ۔لڑائی ہوتے ہی بیوی سب سے پہلے بُرقعہ سنبھالتی ہے ۔ اور حسب استطاعت کسی سواری میں سوار ہوکر میکے پہنچ جاتی ہے ۔

میکہ گویا میاں بیوی کی لڑائی میں ایک پناہگاہ کا کام دیتا ہے ۔اس لئے جن بیویوں کے میکے بفضل تعالیٰ موجود اور بھرے بھرائے ہیں وہ اپنے شوہروں سے بالکل نہیں ڈرتے ۔ اور لڑائی کیلئے ہر وقت ایسے تیار رہتی ہیں جیسے کسی ملک کی فوج تیار رہتی ہے ۔ادھر شوہر نے بیوی پر غصہ اُتارا اُدھر بیوی نے فوراً بُرقعہ لیا اِدھر شوہر نے مارنے کے لئے ہاتھ بڑھایا ادھر بیوی نے گھر سے باہر قدم بڑھایا ۔جیسے بیوی میکے پہنچی ماں باپ نے بیٹی کو یقین دلایا پرواہ نہ کر بیٹی ہم موجود ہیں اس تسلی کے بعد خاطر خواہ تواضع شروع ہوگئی ۔بہنیں بستر لگا رہی ہیں ۔بھائی فروٹ لا رہے ہیں ۔باپ بیٹی کے لئے ساڑھی خریدنے گئے ہیں ۔ماں باورچی خانے میں سویاں پکا رہی ہے ۔کوئی بیوی کو ذرا سا کام

بھی کرنے نہیں دیتا۔جس بیوی کو سسرال میں سر کھجانے کی فرصت نہ تھی۔وہ میکے میں اگر کوئی کام کرتی ہے تو صرف یہ کہ ماں کے سر سے جوئیں نکال نکال کر مار رہی ہے ۔دن بھر اور رات بھر سونا یا بہن بھائی کے ساتھ کیرم کھیلنا لیکن اس کے باوجود بیوی کا دھیان دروازے پر لگا ہے کہ شاید وہ دروازہ کھٹکھٹائیں ادھر میاں صاحب بیوی کے چلے جانے کے بعد پچھتا رہے ہیں کہ ''لاحولہ ولاقوۃ'' میں بھی عجیب سوڈا واٹر واقع ہوا ہوں۔خواہ مخواہ ابل پڑا۔ہوٹل میں کھاتے کھاتے شوہر اپنی دوائیاں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔گھر کی دُرگت بنی ہوئی ہے گھر میں کئی روز سے جھاڑو نہیں پھری۔پھر گھر کاٹنے کو دوڑ رہا ہے۔اور گھر میں وقت کاٹنا مشکل ہو گیا ہے۔ویسے زبان سے دونوں یہی کہیں گے کہ میاں: اجی میری جوتی کو غرض پڑی ہے۔جو اسے منالاؤں۔شرع نے تو چار شادیوں کی اجازت دے رکھی ہے۔بیوی:۔توبہ کرو۔خالہ جان۔وہ لینے آئیں تب بھی نہ جاؤں دونوں ظاہری اکڑوں دکھاتے ہیں مگر اندرونی طور پر چاہتے ہیں کہ شوہر کی مونچھ اور بیوی کی ناک دونوں اونچی رہیں اور صلح ہو جائے اور اسی قسم کی صلح کا بالعموم یہ طریقہ نکالا جاتا ہے کہ بیوی یا شوہر دونوں جو جھٹ پٹ بیمار پڑ جاتے ہیں اور اطلاعات بھجوائی جاتی ہیں کہ حالت بڑی خراب ہے۔بس آخری بار صورت دکھا جائیں ۔حالانکہ دونوں کو نزلہ زکام کے سوائے کوئی بیماری نہیں ہوتی۔صورت دیکھنے کے بعد'' حالت میرس''۔راز اگرچہ فاش ہوتا ہے لیکن دونوں زبان پر نہیں لاتے۔کیونکہ دونوں کا دل ایک دوسرے سے ملنے کے لئے بے تاب ہوتا ہے۔بیوی ناک سڑسڑ کرتی ہوئی بُرقعہ اوڑھے اور میاں جھینپتے پوئے بیوی کے لئے بے بی ٹیکسی لاتے ہیں۔اس کے بعد اگلی لڑائی تک دونوں میاں بیوی نے ایسی گاڑھی چھنتی ہے کہ جیسے ابھی ابھی شادی ہوئی ہو۔اور وہ ہنی مون منا رہے ہوں چاہے ان کی شادی کو پچاس برس کیوں نہ گزر گئے ہوں آج ہم نے میاں بیوی کی لڑائی کو اس لئے موضوع بنایا ہے کہ جب بیویاں اپنے شوہروں سے اور جو شوہر اپنی بیویوں کے ساتھ رہتے رہتے بیزار سے ہو گئے اور بیویاں اپنے میکے یا رشتہ داروں کے گھر چلی جائیں کیونکہ محبت کا بھی ایک جغرافیہ ہوتا ہے ۔پر محبت میں فاصلے کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔بلکہ ہم تو کہتے ہیں کہ محبت ہی فاصلے کا دوسرا نام ہے۔

آدم چغتائی برمنگھم

عارضی زیست کا سایہ بھی یقیں لگتا ہے
پی نیندوں کا ہر اک خواب حسیں لگتا ہے
جس سے منسوب ہے انساں کی توقیر و نجات
خالق و کون و مکاں دل کے قریں لگتا ہے
روح تو پاک ہے حق بات کو تسلیم کرے
ذہن پا بستۂ اوہام و یقیں لگتا ہے
حُسنِ اخلاق کہ جس نے دیا انساں کو ظرف
آدمی ذات کی جنت کا امیں لگتا ہے
تیرے ہی نور سے چمکی ہے ستاروں کی جبیں
چاند کا روپ مجھے تیری جبیں لگتا ہے
نیند آتی ہے کہاں یاد میں سودائی کو
یاد کا عکس مجھے عرشِ بریں لگتا ہے
عہدِ ہجرت میں بھی وہ ساتھ ہے میرے آدم
اُس کا ہر نقش مرے دل کا مکیں لگتا ہے

بسم اللہ کلیم۔۔۔اردو کی تعریف

اردو دی تعریف کراں پنجابی وچ تے فیر کی اے
جے کُجھ پتیاں نال نے پُھل گلابی نال تے فیر کی اے
اکو ماں دیاں دھیاں اک وڈی تے اک نکی اے
اک غریب تے دوجھی پلی وچ نوابی وچ تے فیر کی اے
روٹی لے ڈیرے تے مٹیار نوں آنا چاہیدا
آوے بھاویں کُھسے یا گُرگا بی وچ تے فیر کی اے
چن تے سورج اُنجھ تے وکھو وکھ نے وچ اَسماناں دے
سورج دی لو اے نور مہتابی وِچ تے فیر کی اے
کھولے بند کرے پھس جاوے تے چابی بھن دیندے او
پھَس جاوے بھئی تالا کدی جے چابی وچ جے فیر کی اے
زاہد عابد مُلاں قاضی سخت کرخت دِلاں دے نے
ہووے رحم دلی جے کسے شرابی وچ تے فیر کی اے
غصہ نہیں کرنا میرے اگلے مصرے تے جے ہووے
نبیاں والی کوئی صفت صحابی وچ تے فیر کی اے

پروفیسر ڈاکٹر پرویز پروازی کا اظہارِ خیال بخش لائلپوری کے متعلق۔

بخش لائلپوری، مہاجر شعراء میں اپنی پہچان رکھنے والا شاعر ہے ''ابھی موسم نہیں بدلا'' اس کا چوتھا مجموعہ کلام ہے۔لہو کا خراج ۱۹۸۵ء میں، زندانِ شہر ۱۹۸۷ء میں، اور بادِ شمال ۱۹۸۹ء میں چھپے تھے۔یہ مجموعہ ۱۹۹۴ء میں منظر عام پر آیا۔غیر ملک میں رہنا اور چاروں طرف سے اپنوں اور غیروں کی غیریت میں گھرے رہنے کے باوجود شعر کہتے چلے جانا اسی کو سزاوار ہے جو حوصلہ منداور جری ہو۔بخش اندر باہر کی کشمکش میں فتح مند ہو کر اُبھرا ہے۔اسے یقین ہے کہ موسم بدلے گا مگر اسے اس بات کا بھی اندازہ ہے کہ ''ابھی موسم نہیں بدلا''۔بخش لائلپوری سے پہلی ملاقات، سٹاک ہالم میں مہاجر ادیبوں کی ورکشاپ ۱۹۹۶ء میں ہوئی۔اس سے قبل بخش لائلپوری کا نام میرے علم میں آچکا تھا۔ذاتی شناسائی کا موقع نہیں آیا تھا وہ بھی آ گیا۔بخش لائلپوری سے ملنے اور اسے سننے

کا موقع ملا تو خیال ہوا کہ بخش لائلپوری دل کے حملے کے بعد کچھ زیادہ ہی فکر مند رہنے لگا ہے۔ جب اس کی کتاب ''ابھی موسم نہیں بدلا'' پڑھی تو اس بات کا یقین آ گیا کہ بخش دل کے ہاتھوں تنگ نہیں بلکہ دوست نما دشمنوں کے ہاتھوں تنگ ہے اسے دوستوں کی منافقت کے خلاف سراپا جہاد پایا۔۔ وہ موسم کے خلاف جہاد میں مصروف ہے کہ موسم بدلے گا۔ منافقت کے منحوس سائے چھٹ جائیں گے۔ دوستی پھر خلوص اور محبت کا رنگ روپ اختیار کر لے گی، بونے قد آور نہیں بنائے جائیں گے۔ اور قد آوروں کی قدر و قیمت ان کے قد و قامت کے حساب سے جانی جائے گی۔ منافقت، جسے ہمارے سائنسدان دوست نصیر احمد خان ''اس دور کا اخلاقی کوڑھ'' قرار دیا تھا، دنیا سے مٹ جائے گی۔ بخش لائلپوری موسم بدلنے کا منتظر شاعر ہے اس نے ابھی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ پُر امید احتجاج بخش کا خاص لہجہ ہے۔ اسے یقین ہے کہ زمانہ اس کے لہجہ کو پہچانے گا کیونکہ اس کا رنگ سخن اشتہار کا محتاج نہیں۔ مزا تو تب جب ہے کہ رنگِ سخن ہو وجہ نمود۔۔۔ جو اشتہار کی محتاج ہو وہ شہرت کیا؟ وہ اس پیام کا علمبردار ہے کہ شاعری میں خود تعین مت کریں اپنا مقام۔۔۔ اس طرح کے فیصلے تو اس طرح ہوتے ہیں بخش لائلپوری سے ملنے کے بعد میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ یہ شخص سچ کو سچ کہنا جانتا ہے اور ایسا کرنے کے کئے اسے دوسری بار سوچنا نہیں پڑتا۔ ہم ایسے دور سے گزر رہے ہیں کہاں سچ کو سچ کہنا ہی سب سے بڑا جرم ہے۔ سچ کو سچ کہنا تو مشکل تھا ہی یہ دور تو جھوٹ کو جھوٹ بھی نہیں کہنے دیتا۔ بخش نے اس میدان میں اتر کر نعرہ لگایا ''شور گھر کے باہر ہے چور گھر سے اندر ہے''۔ اندر کے چور کو للکارنے کا نام بخش لائلپوری ہے۔ مارے ہاں ایک بدعت چل پڑی کہ ہم شہروں کے نام بدلنے لگے منٹگمری کو ساہیوال کہنا تو بجا تھا کہ یہی اس شہر کا پرانا نام تھا کیمپور کو اٹک کہہ دینا بھی مناسب تھا کہ تاریخ میں یہی نام مروج رہا مگر لاہلپور کو فیصل آباد کہنا تو ایسے ہی تھا جیسے ایک غیر ملکی کے نام کو ہٹا کے دوسرے غیر ملکی کا نام اختیار کر لیا جائے پہلے نے تو یہ شہر بسایا تھا دوسرے نے اس شہر کو سوائے نحوستوں کے اور کیا دیا ہے؟ بخش لائلپوری نے اس بدعت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اگر وہ بھی بخش لائلپوری کی بجائے بخش فیصل آبادی لکھنے لگتے تو یونہی لگتا جیسے انہیں مسلمانیاں بٹھا دیا گیا ہو۔ بخش نے اس تکلیف دہ عمل سے گزرنے سے انکار کر دیا اس سے یہ معلوم ہوا کہ بخش لائلپوری دوسروں کے کئے ہوئے فیصلے اپنے اوپر مسلط نہیں کرتا اسے دوسروں کے احمقانہ فیصلوں کو رد کرنے کا حوصلہ بھی ہے۔ مہاجر ادیبوں کی کانفرنس میں جو مسائل زیر بحث آئے لوگ ان کے بارہ میں مقالے لکھ کر لائے تھے مگر بخش لائلپوری نے ان سب مقالوں کا جواب پہلے سے اپنے مجموعہ کلام میں دے رکھا تھا۔ اس کی کتاب ''ابھی موسم نہیں بدلا'' کا عنوان ہی نہیں اس کا سارا متن ہی مہاجرت کے عنوانات سے مملو ہے :۔

درد ہجرت کے ستائے ہوئے لوگوں کو کہیں
سایہ در بھی نظر آئے تو گھر لگتا ہے

بھٹک رہے ہیں ابھی زیست کے سرابوں میں
مسافروں کو ابھی شعور سفر نہیں آیا

دیارِ غیر میں وہ مرا سر پھرا بیٹا
گیا ہے گھر سے تو پھر لوٹ کر نہیں آیا

دشتِ غربت کی بلاؤں سے بھی ڈر لگتا ہے
گھر کی بے رحم فضاؤں سے بھی ڈر لگتا ہے

ہجرتوں سے لہو لہو خلقت
خوبصورت دیار مانگتی ہے

ہمیں ہر آن آمادہ بہ ہجرت
ہمارا آب و دانہ مانگتا ہے

بخش لائلپوری کو اپنے لہجے اور اپنے نو بہ تخیل پر اعتماد ہے اسی لئے وہ کہتا ہے:۔

نو بہ نو تخیل ہے دل پذیر مصرعے ہیں

بخش شعر گوئی کا آخری پیمبر ہے۔

اور یہ بات اس دور میں کہہ رہا ہے جب تنگ نظر مُلا نے ذہنوں کو مسموم کر رکھا ہے مذہب کے نام پر دہشت گردی روا رکھی جا رہی ہے جہالت کا سکہ رائج ہے:۔

ہر مکتبِ علم و ادب پہ چھائی ہیں
فروغِ عام پہ مائل جہالتیں کیا کیا

بخش لائلپوری ہر اس رویہ کو للکارنے کی جرات رکھتا ہے جو اسے نوع انساں کی ترقی میں حائل نظر آتا ہے اپنے وطن میں جو سرکاری و درباری ادب رائج کرنے کی کوشش کی گئی اور جس طرح بڑے بڑے جگادری ادیب اس دہلیز پر سر بسجود ہوئے۔ بخش لائلپوری نے بلا خوف لومتہ لائم اس کے خلاف احتجاج کیا۔ اس کا احتجاج رائیگاں نہیں گیا کیونکہ اس کے بعد کئی ایسے آئے جو اس کی راہ پر چلنے والے تھے۔ بخش لائلپوری کے ہاں احتجاج کے لئے مزاحمتی ادب کی روایتی علامتیں در نہیں آئیں مگر ان علامتوں کے نہ ہونے کے باوجود اس نے اپنے لہجے میں ایسی تلخی پیدا کر لی ہے کہ اس کا احتجاج نمایاں ہو کر ابھرتا ہے:۔

کھا لیا ہے تو اسے دوست مانگتے کیوں ہو؟
ایسے پیڑوں پر تو ایسا ہی ثمر لگتا ہے

ٹپک رہی ہے خباثت ہر ایک چہرے سے
اُبل رہی ہیں دلوں میں کدورتیں کیا کیا

بخش لائلپوری نے نوارا تلخ ترمی زن کو اختیار کیا ہے مگر اس کے باوجود اس میں ذوق نغمہ کی کمیابی نہیں ہے۔۔ بخش لائلپوری کے ہاں ہمارے معاشرہ میں رواج پا جانے والی متضاد کیفیتوں کا احساس بہت نمایاں ہے اس نے انہی متضاد کیفیتوں کے تضاد کو بار بار بیان کیا ہے تا کہ پڑھنے والے پر ہمارے معاشرہ میں راہ پا جانے والے دوغلے پن کا

اظہار ہو سکے۔ ''پتھر کو بت لکھیں کبھی بت کو خدا لکھیں''

''دیدہ بے رنگ میں خوں رنگ منظر رکھ دیئے''۔روح در بستہ بدن پتھر کی دیواروں میں بند۔منظروں نے دیکھا ہے فاصلوں نے دیکھا ہے''۔غرض ان کے ہاں تضاد گری کی کیفیت بہت نمایاں کیفیت ہے اور اسی ناطے سے وہ اپنے قاری کو جھنجھوڑتے چلے جاتے ہیں۔مجھے یقین ہے کہ بخش لائلپوری کی موسم بدلنے کی آرزو ضرور پوری ہوگی۔

عبدالجلیل عباد جرمنی

اُسکے در کے فقیر ہیں صاحب۔اس لئے ہی امیر ہیں صاحب
ہم بھی ہر روز بانٹتے ہیں شعر اپنی جاگیر ہیں صاحب
عشق میں مبتلا ہیں ہم صاحب۔گاتے ہر روز ہیر ہیں صاحب
پڑھ لو ہم کو کبھی بھی تم صاحب۔جا بجا ہم تحریر ہیں صاحب
جن کو کرسی کی ہو پڑی صاحب۔ہم نہیں وہ امیر ہیں صاحب
کجکلاہی میں جو پڑے صاحب وہ انا کے اسیر ہیں صاحب
تلخیاں بھر گئیں بہت صاحب۔لہجے اب تو چیر ہیں صاحب
رِستا رہتا ہے خون یہ صاحب کیا کریں دل میں تیر ہیں صاحب
آپ سے پیار ہے بہت صاحب۔آپ تو میرے پیر ہیں صاحب
چار سُو اندھیر ہے صاحب۔روشنی کی لکیر ہیں صاحب
آنکھیں جو خواب دیکھتیں صاحب ۔آپ اُن کی تعبیر ہیں صاحب
قافلہ عشق کا جو ہے صاحب۔عبادؔ اس کے اسیر ہیں صاحب

ڈاکٹر محمد عقیل اظہر۔۔۔۔۔ امریکہ

میرے مولا یہ کیسی بستی ہے؟
زندگی یہاں کیوں سستی ہے؟
ایسی ہستی کی کوئی ہستی ہے
ہر طرف آگ سی برستی ہے
امن کو انسانیت ترستی ہے
جا بہ جا نفرتوں کے میلے ہیں
چند انساں ہیں جو اکیلے ہیں
میرے آقا میرے محمدؐ نے
صلح پیار کا پیغام دیا
موسیٰ عیسیٰ تو نے کہلایا
کرشن بھگوان نے بھی سمجھایا
پیر ہے زندگی ،زندگی ہے پیار
جتنے آئے ہیں پیغمبر اوتار
سب کا پیغام سویرا ہے
ظلمتوں کا یاں بسیرا ہے
آج اتنا تو پوچھ لینے دو
کیا یہ قصور میرا ہے

اسلام اور احترام میت اے آر راجپوت

مذہب کا مقصد تہذیب اور شائستگی، حوصلہ مندی اور بُردباری، ہمدردی اور رواداری کے اخلاق پیدا کرنا ہے انسان میں بوجہ حیوان ہونے کے ایک طبعی وحشت کا عنصر ہے۔مذہب آکر اس کی تہذیب کرتا ہے اور اسے ایک اعلیٰ خلق یعنی شجاعت میں بدل دیتا ہے۔اسلام نے اپنے اولین مخاطبین میں اس تہذیب اور خلق کے وصف کو اتنے اعلیٰ معیار تک پہنچایا کہ وہ کائنات میں نمونے کے انسان قرار پائے۔سورہ بقرہ آیت ۱۴۳ میں فرمایا؛''ہم نے تم کو اعلیٰ معاشرہ پیش کرنے والی قوم بنایا جو دنیا کے لئے نمونہ اور بطور گواہ کے ہوں اور تمہارے رسولؐ کو جو خلق عظیم پر قائم ہیں تمہارے لئے نمونہ اور اسوہ حسنہؐ بنایا ہے۔

فوت شدہ انسان کے جسد کا کیا کیا جائے؟

اس کے لئے مختلف مذاہب نے مختلف طریقہ ہائے احترام کی ہدایات دی ہیں لیکن احترام کا سب سے بہتر طبعی اور الہامی طریق وہ ہے جسے اسلام نے اپنایا۔اور فوت شدہ انسانوں کے جسد کو زمین میں دفنانے کی ہدایت دی۔مردہ کو دفنانے کی یہ قدیم رسم اور وہ پہلی انسانی سوچ ہے جو تمثیلی زبان میں آدم کے دو بیٹوں کے واقعہ کی صورت میں انسانی علم کا حصہ بنی۔

احترام میت اور اسلامی تعلیم

آنحضرت ﷺ نے فرمایا:''تم وفات یافتہ لوگوں کو بُرا بھلا نہ کہو ان سے بُرا سلوک نہ کرو کیونکہ وہ اپنے خدا کے حضور پہنچ چکے ہیں'' (المستدرک کتاب الجنائز) اسی طرح حضرت عمرہ بنت عبدالرحمٰن بیان کرتی ہیں کہ'' آنحضرت ﷺ نے قبروں کو بدنیتی اور بے حرمتی کے طور پر اکھیڑنے والوں پر لعنت بھیجی ہے'' (موطا امام مالک) اسی طرح ابو داؤد کی روایت میں ہے کہ جو شخص کسی مردے کی قبر بدنیتی سے اکھیڑتا ہے تو اسے قطع ید کی سزا دی جائے کیونکہ وہ ایک میت کے گھر میں داخل ہوا ہے' ابوداؤد کتاب الحدود)فقہ کی مشہور کتاب بحرالرائق میں میں لکھا ہے:''اگر قبر کھنگی ہو جائے تو اس میں یہودی کی ہڈیاں نظر آجائیں تو ان کی بے حرمتی نہ کی جائے کیونکہ ان ہڈیوں کی حرمت بھی وہی ہے جو مسلمانوں کی ہڈیوں کی ہے نیز جب زندگی میں ان سے ظالمانہ سلوک کرنا اور ان کی بے حرمتی کرنا منع ہے تو ان کی وفات کے بعد بطریق اولیٰ یہ ممانعت قائم ہے''(بحرالرائق)اسی طرح بدائع الصناء میں لکھا ہے کہ''توہین کی غرض سے قبر اُکھیڑنا حرام ہے''(بحرالرائق)**احترام میت کے بعض واقعات**

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ تشریف فرما تھے کہ ایک جنازہ گزرا آپ اس کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔کسی نے کہا یہ تو ایک یہودی کا جنازہ ہے۔آنحضرت ﷺ نے فرمایا

کیا ہوا انسان تو ہے گویا انسانیت کا احترام آنحضرت ﷺ کو بہت تھا۔ جنگ خندق میں ایک کافر سردار خندق میں گر کر ہلاک ہو گیا۔ اور لاش پر مسلمانوں نے قبضہ کر لیا۔ کفار نے پیش کش کی کہ دس ہزار درہم لے لیں اور یہ لاش اُن کو دے دی جائے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہم مردہ فروش نہیں ہیں ہم اس کی دیت نہیں لیں گے۔ اور پھر بلا معاوضہ اس لاش کو واپس کر دیا۔ (شرح الامام علامہ محمد بن عبدالباقی الزرقانی) اسی طرح آنحضرت ﷺ یہ طرز عمل تھا کہا گر میدان جنگ میں یا اس قسم کے حالات میں آنحضرت ﷺ کو کوئی لاش پڑی ملتی تو آپ ﷺ اس کی تدفین کا حکم دیتے یہ نہ پوچھتے کی یہ مومن کی لاش ہے یا کافر کی۔ (السیرۃ اہلبیت) آنحضرت ﷺ اپنے چچا اور حضرت علیؓ کے والد ابو طالب کی وفات پر حضرت علیؓ کو ارشاد فرمایا کہ ''آپ اپنے والد کی تجہیز و تکفین کریں اور غسل دیں پھر ان کو دفنائیں (السیرۃ الحلبیہ)

ایک قبرستان میں مسلمانوں اور غیر مسلم کی تدفین

جہاں تک ایک قبرستان میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کی تدفین کا تعلق ہے کئی واقعات ملتے ہیں کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے قبرستان بعض اوقات اکھٹے ہوتے تھے۔ حضرت خدیجہؓ اور دوسرے صحابہ کی تدفین اس قبرستان میں ہوئی جو مکہ کا پرانا آنحضرت ﷺ کا پرانا خاندانی قبرستان تھا اور اس میں مکہ کے وہ لوگ بھی دفن ہوا کرتے تھے جنھوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا یہی جگہ بعد میں جنت المعالی کہلائی۔ الرحلۃ الحجازیہ کے مصنف محمد اللبیب مکہ کی تاریخ لکھتے ہوئے رقمطراز ہیں'' جنت معالیٰ مکی قبرستان ہے اس میں حضرت خدیجہؓ کا مزار مبارک ہے۔ حضرت خدیجہؓ کی قبر کے پاس ہی مکہ کے سولہ سرداروں کی قبریں ہیں ایک روایت کے مطابق حضرت خدیجہؓ کی قبر کے پاس آنحضرت ﷺ کی والدہ ماجدہ سیدہ آمنہ کا مزار بھی ہے قریب ہی ابو طالب کا مزار ہے'' (الرحلۃ الحجازیہ) اسی طرح ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک یہودیہ فوت ہوئی تو حضرت عمرؓ کی اجازت سے اس کی تدفین مسلمانوں کے قبرستان میں ہوئی (السنین الکبریٰ کتاب الجنائز) خلافت عباسیہ کے دور میں جب بغداد کی بنیاد رکھی گئی تو وہاں ایک پرانا مجوسیوں کا قبرستان تھا۔ اس قبرستان میں مسلمانوں کی تدفین بھی ہوا کرتی تھی۔ اور پہلی مسلمان خاتون جس کی اس قبرستان میں تدفین ہوئی وہ بانو قتہ تھی نیز اس قبرستان میں بعد میں بڑے بڑے بزرگ مثلاً حضرت امام ابوحنیفہؒ، حضرت امام محمد بن اسحاقؒ، حسن بن زید، ہشام بن عروہ اور خیزران دفن ہوئے۔ اسی طرح یہ مسلمانوں کا قبرستان بن گیا۔ (تاریخ بغداد مدینۃ الاسلام) انگلستان اور یورپ میں جو مسلمان فوت ہوتے ہیں باالعموم ان کی تدفین ایسے ہی قبرستان میں ہوتی ہے۔ جس میں عیسائی بھی دفن ہوتے ہیں اس پر نہ کبھی عیسائیوں نے اعتراض کیا نہ کبھی مسلمانوں نے۔ لاہور کے میانی قبرستان کے دو حصے ہیں ایک حصہ میں مسلمان اور دوسرے حصہ میں عیسائی دفن ہوتے ہیں اور کوئی حدِ فاصل نہیں۔ **مُردوں کی بے حرمتی کی تاریخ۔** یہ عجیب بات ہے کہ ابتدائی تربیت اور انوارِ نبوت سے فیض یافتہ بندگان خدا کے کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد لوگ اصل تعلیم کو بھول جاتے ہیں۔ اور بعض انسانوں کی طبعی وحشت اور بربریت دوبارہ لوٹ آجاتی ہے۔ جہاں تک انسانی میت کی توہین و تذلیل کا تعلق ہے تو اس سے فوت ہو جانے والے کا کچھ نہیں بگڑتا صرف ظالمانہ ایسی حرکات کرنے والے انسان اپنی عاقبت خراب کرتے ہیں۔ اپنے مغلوب الغضب ہونے اور وحشی ہونے کا ثبوت مہیا کرتے ہیں۔ اگر فوت ہو جانے والا اپنے مولا کے ہاں مقبول ہے تو پھر دنیا والوں کی طرف سے توہین آمیز سلوک اس کے درجات کی بلندی کا سامان بن جاتا ہے۔ نعشوں اور قبور کی بے حرمتی کا سلسلہ قدیم سے جاری ہے لیکن اس قسم کی وحشت اور بربریت کا پہلا واقعہ جو تاریخ نے محفوظ کیا ہے وہ شہید مظلوم حضرت عثمانؓ کی نعش کی بے حرمتی کا ہے۔ جو جاہل اور غصے سے بے قابو ہونے والے مصر اور دوسرے علاقوں کے جتھوں میں شامل نومسلموں کی طرف سے وقوع پذیر ہوئی۔ روایات میں آتا ہے'' جب حضرت عثمانؓ کی شہادت ہوئی تو تین دن تک شر پسندوں نے دفن کرنے میں رکاوٹ ڈالی۔ آخر تین دن کے بعد مدینہ کے کچھ با اثر لوگوں نے جن میں حضرت حکیم بن حزامؓ اور حضرت جبیر بن مطعمؓ بھی تھے۔ حضرت علیؓ سے ان کی تدفین کے متعلق بات کی۔ شر پسندوں کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ راستہ میں پتھر لے کر بیٹھ گئے اور جنازہ گزرتے وقت ان پر پتھراؤ کیا مدینہ میں ایک احاطہ تھا جس کا نام حش کوکب تھا یہودی اس میں دفن ہوتے تھے۔ چونکہ جنت البقیع میں شر پسند حضرت عثمانؓ کے جسد مبارک کو دفن ہونے نہیں دیتے تھے، اس لئے آپ کی نعش کو حش کوکب میں دفنانے کا پروگرام بنایا۔ اور رات کے وقت اس کی تدفین کی گئی

نعشوں کی بے حُرمتی کے دیگر واقعات۔ اس کے بعد شہید مظلوم حضرت امام حسینؓ کی نعش مبارک کی بے حرمتی کا واقعہ آتا ہے۔ ان کا سر مبارک کاٹ کر یزید کے دربار میں پیش کیا گیا اور باقی جسم مبارک کربلا ہی میں رہا۔ حضرت ایوب انصاریؓ کی تدفین قسطنطنیہ کی فصیل کے قریب ہوئی عیسائیوں نے آپ کے مزار کی بے حرمتی کا ارادہ کیا تو تو بنو امیّہ کے خلیفہ نے دھمکی دے دی اور یہیں کام رک گیا۔ (اسد الغابہ) پھر جب عباسی دور آیا تو عباسیوں کے پہلے خلیفہ ابوالعباس سفاح نے اموی خلیفہ کی قبروں کو اکھیڑا اور ان کی نعشوں کی بے حرمتی کی۔ ہشام بن عبدالملک جس کی نعش صحیح وسالم تھی اس کو نکلوایا پہلے اس کو کوڑے لگوائے پھر سولی پر لٹکایا پھر اس کو جلایا۔ (الکامل فی التاریخ ابن اثیر) سپین میں عیسائیوں نے غلبہ پانے کے بعد مسلمانوں کے قبرستانوں کی سخت بے حرمتی کی اسی طرح یہودیوں کے قبرستانوں کو بھی نہ بخشا گیا۔ تاریخی واقعہ ہے کہ بعض عناصر نے سازش کرتے ہوئے یہ کوشش کی کہ حضور ﷺ کے مزار مبارک کی بے حرمتی کی جائے لیکن اس زمانہ کے مشہور مسلمان بادشاہ نورالدین زنگی نے خواب کے ذریعہ خوب اس کی حفاظت کی۔ اور مزار کے اردگرد تانبا اور سیسہ پگھلا کر ہمیشہ کے لئے اس خطرہ کو ٹال دیا۔ مشہور سکھ لیڈر بندہ بیراگی نے سرہند شریف کے قبرستانوں کی بے حرمتی

کی قبریں کھول کر نعشیں نکالیں اور ان سے وحشیانہ سلوک کیا اور ہڈیوں کو نذرِ آتش کر دیا۔۔(سکھ مسلم تاریخ حقیقت کے آئینے میں ص ۱۵۷)

انگریزوں کا جب سوڈان پر تسلط ہوا تو انہوں نے مہدی سوڈانی کی نعش کو قبر سے نکالا اس کے ٹکڑے ٹکڑے کئے اور دریا میں بہا دیا اسی طرح دوسرے مسلمانوں کی نعشوں کی بھی بے حرمتی کی (آئمہ تلبیس مولفہ ابوالقاسم رفیق) انگریزوں نے جب ہندوستان پر قبضہ کیا تو لاہور میں مسلمانوں کے کئی مقبروں کو نیلام کرا دیا۔ جنہیں لوگوں نے گرا کر مکانوں اور کوٹھیوں میں تبدیل کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ جو علاقے آج کل گوالمنڈی، ہال روڈ اور انارکلی کہلاتے ہیں یہ کسی زمانہ میں قبرستان تھے۔ غرضیکہ ایک وہ اخلاق ہیں جو اسلام سکھاتا ہے حضورﷺ کے ارشادات ہیں جن میں نرمی، رواداری، ہمدردی، احترام انسانیت اور احترام میت کے سبق دیئے گئے ہیں۔ دوسری طرف غضب سے مغلوب جاہلیت کے پرستار اور مذہب و اخلاق سے نابلد بے حوصلہ افراد اور گروہ ہیں جن کی وحشت اور بربریت سے انسان کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ حضورﷺ کی تعلیم سراسر رفق اور نرمی و تلطف پر مبنی تھی۔ حضورﷺ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نرمی کرنے والا ہے نرمی کو پسند کرتا ہے نرمی کا جتنا اجر دیتا ہے اتنا سخت گیری کا نہیں دیتا بلکہ کسی اور نیکی کا بھی اتنا اجر نہیں دیتا۔ غرض اسلام کی ایسی حسین تعلیم کو بھلا کر لوگ خود اپنے لئے ذلت خواری کا طریق اختیار کرتے ہیں کاش وہ سمجھیں کہ ہمارے پاک و مطہر رسول حضورﷺ نے ان کو کیا تعلیم دی تھی اور آپ کا اسوہ حسنہ کیا تھا۔

عاصی صحرائی

حقیقت کو مٹایا جا رہا ہے
سب کو پاگل بنایا جا رہا ہے
اُسے وقت بدلنا آ گیا ہے
جسے گھڑیال تھمایا جا رہا ہے
ہماری مفلسی کہہ رہی ہے
ہمارا حق کھایا جا رہا ہے
لالچ کی لوری سنا کر
ضمیروں کو سُلایا جا رہا ہے
نمائندہ حکومت مر چکی ہے
حقائق کو چھپایا جا رہا ہے
تُعصب کی بین بجا کر
جہالت کا جادو چلایا جا رہا ہے
بچوں کو غلط تعلیم دے کر
وقت کا دشمن بنایا جا رہا ہے
ابلیس کا نصاب پڑھا کر
سب کو ابو جاہل بنایا جا رہا ہے

عدیم ہاشمی

پھر بھی بیٹھی ہے خزاں باغ کی دیوار کے ساتھ
جبکہ پتا بھی نہیں ہے کوئی اشجار کے ساتھ
تم بڑے لوگ ہو سیدھے ہی گزر جاتے ہو
ورنہ کچھ تنگ سی گلیاں بھی ہیں بازار کے ساتھ
مرے اشکوں پہ تجھے اتنا تعجب کیوں ہے
تو نے چشمے نہیں دیکھے کبھی کہسار کے ساتھ
میں نے پہچان لیا دور سے گھر تیرا ہے
پھول لپٹے ہوئے دیکھے جہاں دیوار کے ساتھ
لفظ نشتر کی طرح دل میں اُتر جاتے ہیں
خط محبت سے بھی لکھتا ہے وہ تلوار کے ساتھ

ثمینہ راجہ

رو لیجئے کہ پھر کوئی غمخوار ہو نہ ہو
ان آنسوؤں کا اور خریدار ہو نہ ہو
کچھ روز میں یہ زخم چراغوں سے جل بجھیں
کچھ روز میں یہ گرمیٔ بازار ہو نہ ہو
عجلت بہت ہے آپ کو جانے کی جایئے
لوٹیں تو پھر یہ عشق کا آزار ہو نہ ہو
سو جائے تھک کے پچھلے پہر چشمِ انتظار
اور کیا خبر کہ بعد میں بیدار ہو نہ ہو
دل کو بہت غرور کشیدہ سری بھی ہے!
پھر سامنے یہ سنگِ درِ یار ہو نہ ہو

میرا شہر لاہور.....ابنِ صحرا

ایک ایسا شہر.....جہاں دیانت اور خیانت میں کوئی تمیز نہیں کی جاتی۔ ایک ایسا شہر.....جہاں ناموس اور بے حیائی ایک ہی ترازو میں تُلتے ہیں۔ ایک ایسی دنیا.....جہاں روکھے پن کا نام شہریت، بے رُخی اور بے پروائی کا نام مصروفیت اور تاجرانہ رکھ رکھاؤ کا نام خلوص ہے۔ ایک ایسا خطہ.....جس کے باشندوں کے حلق سے نیچے کوئی چیز اُترتی ہی نہیں جو صرف ذوق سماع ہی کے قائل ہیں! جہاں گرمیوں میں باغ، پارکوں میں سونے والوں کے سر پتھروں سے کچل دیئے جاتے ہیں۔ جہاں منجمد کرنے والی سردی سے اکڑ کر اکثر مفلوک الحال مسافر اور فقیر فُٹ پاتھوں پر اور پُلوں کے کناروں پر مر جاتے ہیں۔ لیکن ان اُمراء کے ہیٹروں کے switch اور

سپلٹ یونٹوں کے ریموٹ اوف نہیں ہوتے۔ جہاں مروت، بیوقوفی کا دوسرا نام ہے جہاں امیر کے جنازے کو کاروں کا جلوس اور بے بس کی ریڑھے پر لد کر جانے والی میت کو بیگار کہا جاتا ہے۔ جہاں ہر چیز اور قدر کا بھاؤ ہر پانچ دس منٹ کے وقفے کے بعد گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ بڑے بڑے وکیلوں، بیرسٹروں سے لے کر میانی صاحب کے جنازہ خوان تک۔ جہاں شاعروں سے متشاعر زیادہ ہیں۔ اور محسوس کر کے کہنے والے صاحبوں کی کثرت ہے۔ پھر ان سے بھی زیادہ ناقدین ادب کی ٹولیاں ہیں۔ ایک ایسا شہر..... جہاں بیٹیوں کی عصمت فروشی کی اور قوم کے لاوارث و یتیم بچوں کو بھیک مانگنے کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔ ایسا شہر جس میں..... جہاں کوئی باہر سے آئی نقدی ہضم کرنا چاہیں۔ ایسا شہر جس میں..... جہاں کرتے ہوئے بیوپار کو سنبھالنا چاہے۔ ایسا شہر جس میں..... جہاں کسی فلم کا افتتاح کرنا چاہیں۔ ایسا شہر جس میں..... جہاں غصب کردہ املاک کے ماتھے پر جعلی لیبل چسپاں کرنا چاہیں۔ ان سب کے لئے ایک ہی نسخہ شافی استعمال ہوتا ہے۔ اسلام، رسول، خدا..... بھلا اس شہر سے بھی کسی کو محبت ہو سکتی ہے؟ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں، یہ سب لکھنے کے قصے ہیں۔ میں نے آج تک کسی ''لاہور'' میں رہنے والے کو سچے دل سے اپنی معمول کی زندگی میں تعریف کرتے نہیں سنا۔ باقی رہی یہ بات کہ محبت کا احساس تو اُس وقت ہوتا ہے جب لاہور سے باہر جانے کا اتفاق ہو۔ یہاں شاہی سطوت کی یادگاریں ہیں جہاں بھی کھڑی کر دیتے جنگل میں منگل ہو جاتا۔ جہانگیر کے مقبرے، شالامار باغ، شاہی مسجد، اور شاہی قلعے والے لاہور کا..... اس میں لاہور کو کیا فضیلت، یہ تو بنانے والوں کے اُس وقت کے اقتصادی مسائل کا تقاضا تھا..... یا حضرت داتا گنج بخشؒ، حضرت میاں میرؒ، حضرت شاہ ابوالمعالیؒ اور حضرت شاہ محمد غوثؒ کا لاہور؟..... لیکن کیا آپ نے کبھی ان مقدس مقامات کے عرسوں کے موقع پر جلوے دیکھے ہیں دور سے کھڑے ہو کر نہیں۔ اندرون خانہ میں گھُس کر کونوں کھدروں میں چھپ کر مجاوروں، متولیوں اور ان کے شرعی دلالوں کے محرم راز بن کر..... نہیں! ..... تو پھر آپ نے لاہور نہیں دیکھا۔ سوداباز وں نے اُس پر جعلی تجارت اور کھوٹے سکوں کے پہرے بٹھا رکھے ہیں۔ کم فہم اور کٹھ پتلی مُلاؤں نے اُس پر نفس پرستی اور حرص و آز کی دبیز چادریں سی ڈال رکھی ہیں۔ ابن الوقتوں اور وطن دشمن لیڈروں نے اُس کی فضاؤں میں محض نعروں کی جھنکار بسا رکھی ہے۔ جھوٹے ادیبوں خامکار نقادوں اور جعلی مصنفوں نے پراپیگنڈے کا ملمع کر کے اس کی معنویت کو مٹیالا سا کر دیا ہے۔ جہاں علماء سُوء کی طرف سے دین کے نام پر رنگے برنگے فتاویٰ فرقہ واریت کو ہوا دینے کی خاطر دیئے جاتے ہیں۔ جہاں مساجد اور امام بارگاہوں میں نہتے اور معصوم شہریوں پر اسلام ہی کے نام پر گولیاں برسا کر خون کی ہولی کھیلی جاتی ہے۔ سب گھناؤنے کاروبار اسلام کے نام پر کئے جاتے ہیں۔ ضمیر فروشان نے لاہور شہر کے ساتھ ساتھ سارے ملک کی زمامِ اقتدار کو تھامنے والوں نے سارے ملک کو اخلاقی، اسلامی، روحانی، معاشرتی، معاشی، سیاسی، طور پر کنگال کر دیا ہے۔ قحط الرجالی کا یہ دور دیکھنے کو ملا کہ کوئی اس ڈوبتی ہوئی کشتی کے لیے ناخدا نہیں مل رہا۔ مولوی، وکلاء، ڈاکٹر، جاگیردار، جج، شرفاء، تاجر، پیر، چشتی، قادری، نقشبندی، مفتی، رائے ونڈی، دیوبندی، بریلوی، گدی نشین، بیوروکریٹس، ۶۵ سالوں میں یہ سب مل کر ایک جناح یا مردِ مجاہد پیدا نہ کر سکے جو ماؤزے تنگ، چو این لائی، مصطفیٰ کمال پاشا کا کردار ادا کر سکے۔ بقول حکیم الاُمت۔۔۔ بتوں سے تجھ کو امید مجھ سے نا امیدی۔۔ بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

پروین شاکر عہد ساز منفرد شاعرہ اے آرخاں

عکسِ خوشبو ہوں بکھرنے سے نہ روکے کوئی
اور بکھر جاؤں تو مجھ کو نہ سمیٹے کوئی

پروین شاکر ۲۴ نومبر ۱۹۵۲ء کو کراچی میں پیدا ہوئی۔ انہوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ انگلش ادب اور زبان میں ڈبل ایم اے کیا۔ اور بنک ایڈمنسٹریشن میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ محکمہ کسٹم میں سول سروس میں آنے سے قبل وہ نو سال شعبہ تدریس سے منسلک رہیں۔ سی ایس ایس کرنے کے بعد ۱۹۸۶ء میں آپ کا بطور سیکنڈ سیکرٹری سی بی آر اسلام آباد تقرر ہوا۔ آپ نے ۱۹۹۱ء میں ہاورڈ یونیورسٹی امریکہ سے ایم کی ڈگری بھی لی۔ آپ نے شاعری کی متعدد کتب تحریر کیں۔ جن میں ''خوشبو'' (۱۹۷۶ میں) ''صد برگ'' (۱۹۸۰ میں) ''خود کلامی'' (۱۹۸۰ میں) ''انکار'' (۱۹۹۰) ''ماہِ تمام'' (۱۹۹۴ میں) ''کفِ آئینہ'' منظر عام پر آئیں۔

جگنو کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کریں۔۔ بچے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے

آپ کی پہلی کتاب خوشبو نے آدم جی ایوارڈ حاصل کیا۔ بعد ازاں انہیں حکومت نے پرائڈ آف پرفارمنس کا ایوارڈ بھی دیا۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۹۴ء کو دفتر جاتے ہوئے ان کی کار ایک ٹرک سے ٹکرا گئی۔ یوں ہم ایک جدید اردو شاعری کے روشن ستارے سے محروم ہو گئے۔ آپ کا قلمی نام ''بینا'' تھا۔ اور وہ احمد ندیم قاسمی کو اپنا استاد مانتی تھیں۔ آپ کی شادی ڈاکٹر ناصر احمد سے ہوئی۔ جبکہ وفات سے تھوڑا عرصہ قبل آپ نے طلاق لے لی تھی۔ آپ کا ایک بیٹا ہے جس کا نام مراد علی ہے۔ پروین شاکر کی رومانی شاعری منفرد اور مقبول عام تھی۔ بہت ہی تھوڑے وقت میں، اور بہت جلد ان کی شاعری قبول عام کی سند حاصل کر چکی ہے۔

وہ تو خوشبو ہے ہواؤں میں بکھر جائے گا مسئلہ پھول کا ہے پھول کدھر جائے گا

آپ بہترین کالم نگار بھی تھیں۔ گوشہ چشم کے نام سے کالم لکھتی رہیں۔ اردو شاعری کو نئی جہت اور نئی تمثیل دے کر نوجوان نسل کے دل میں گھر کر جانے والی پروین شاکر جلد ہی اس دنیا سے رُخصت ہو گئیں۔ پروین شاکر کی طرح ابھی بھی کچھ سر پھرے ادبی مجنوں یا لوح و قلم کی پرورش کی مرض میں مبتلا اپنے خونِ جگر سے ادب کے لالہ زاروں کی آبیاری کر رہے ہیں بقول شاعرِ مشرق۔ ع نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر!

ساحرلدھیانوی

خودداریوں کے خون کو ارزاں نہ کر سکے
ہم اپنے جوہروں کو نمایاں نہ کر سکے
ہو کر خراب مے ترے غم تو بھلا دیئے
لیکن غمِ حیات کا درماں نہ کر سکے
ٹوٹا طلسم عہدِ محبت کچھ اس طرح
پھر آرزو کی شمع فروزاں نہ کر سکے
کس درجہ دل شکن تھے محبت کے حادثے
ہم زندگی میں پھر کوئی ارماں نہ کر سکے
مایوسیوں نے چھین لئے دل کے ولولے
وہ بھی نشاطِ رُوح کا ساماں نہ کر سکے

قتیل شفائی

کبھی نہ جس کا کوئی اعتبار ہم نے کیا
ستم یہ ہے اسی قاتل سے پیار ہم نے کیا
دیا تو ہوگا کسی اور کو بھی دل اُس نے
مگر کبھی نہ اُسے شرمسار ہم نے کیا
رُلا دیا اُسے ہم نے بھی جھوٹے وعدے سے
اُسی کے تیر سے اُس کا شکار ہم نے کیا
دیا جو دل تو لیا درد اس کے بدلے میں
تمام عمر یہی کاروبار ہم نے کیا
قتیلؔ شام کا پہلا ستارا جانتا ہے
کسی کا صبح تک انتظار ہم نے کیا

منیر نیازی

اس شہر سنگ دل کو جلا دینا چاہیئے
پھر اس کی خاک کو بھی اُڑا دینا چاہیئے
ملتی نہیں پناہ ہمیں جس زمین پر
اک حشر اُس زمین پر اُٹھا دینا چاہیئے
حد سے گزر گئی ہے یہاں رسمِ قاہری
اس دہر کو اب اس کی سزا دینا چاہیئے
اک تیز رعد جیسی صدا ہر مکان میں
لوگوں کو ان کے گھر میں ذرا آنا چاہیئے
گُم ہو چلے ہو تم تو بہت خود میں اے منیرؔ
دنیا کو کچھ تو اپنا پتہ دینا چاہیئے

احمد فراز

قربتوں میں بھی جدائی کے بہانے مانگے
دل وہ بے مہر کہ رونے کے بہانے مانگے
ہم نہ ہوتے تو کسی اور کے چرچے ہوتے
خلقتِ شہر تو کہنے کو فسانے مانگے
یہی دل تھا کہ ترستا تھا مراسم کے لئے
اب یہی ترک تعلق کے بہانے مانگے
اپنا یہ حال کہ جی ہار کے لُٹ بھی چکے
اور محبت وہی پیار پرانے مانگے
دل کسی حال پہ قانع ہی نہیں جانِ فرازؔ
مل گئے تم بھی تو کیا اور نہ جانے مانگے

قائداعظم محمد علی جناحؒ اور مشاہیران عالم عاصی صحرائی

کسی بھی شخص کی شخصیت جاننے کے لئے اس کے کارہائے نمایاں کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح نے برصغیر کی سیاست میں سیاسی کاناموں کی وجہ سے نمایاں مقام حاصل کیا۔ان کی شخصیت کا جائزہ لینے سے قبل یہ ضروری ہے کہ قائداعظم محمد علی جناحؒ کے دور کے مختلف نامور افراد کی آراء کا مطالعہ کیا جائے تو اس سے آپ کی شخصیت مزید نکھر کر سامنے آئے گی۔**جان کنتھر**۔۔مسٹر جناح کی زبان سحر انگیزی پر مشتمل تھی۔پاکستان ہمارا ہے۔دین اسلام پر نثار ہو جائیں گے۔قائد کی زبان سے جب ادا ہوتے ہیں تو دس کروڑ مسلمان ہند فلک شگاف نعرے بلند کرتے اور پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتے۔**جگت نرائن لال**۔وہ کسی بھی طاقت کے آگے جھکنا نہیں جانتے تھے انہوں نے ہر محاذ پر انگریزوں اور ہندوؤں کو شکست دی۔**سر تیج بہادر سپرو**۔حصول پاکستان قائداعظم کا ایسا روشن کارنامہ ہے۔جو رہتی دنیا تک یادگار رہے گا۔**لوئی فشر**۔مسٹر جناح ایک ذہین پارلیمانی شخصیت ایک ہوشیار نقاد اور ایک بے لوث سیاستدان ہیں۔**مسولینی**۔(سابق سربراہ اٹلی) قائداعظم کے لئے یہ بات کہنا غلط نہ ہوگی۔کہ وہ ایک ایسی تاریخ ساز شخصیت ہیں جو کہیں صدیوں میں جا کر پیدا ہوتی ہیں۔**لارڈ سٹرا بوگی**۔قائد اعظم نے صحیح قیادت دے کر واشنگٹن، گیری بالڈوگ، اور بسمارک سے بھی بڑا کارنامہ انجام دیا ہے پاکستان ایک بڑی قوم کا بڑا ملک ہے۔**ڈاکٹر سلطان شہر یار (سابق وزیراعظم انڈونیشیا)** مسٹر جناح بہت پُر کشش آدمی ہیں۔ایک مقناطیسی شخصیت، مسٹر جناح کی جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ ان کی خود اعتمادی اور صاف گوئی ہے۔وہ اپنے مدعا کے مکمل و مونثر اظہار پر ساحرانہ قدرت رکھتے ہیں۔**خالدہ ادیب** خانم۔قائداعظم مسلمانوں کے عظیم لیڈر تھے۔قدرت نے انہیں قیادت ہی کے لئے پیدا کیا ہے۔**ڈاکٹر ماہ پار نوالی (ایران)** فکر قائد کی روشنی سے عالم اسلام کو فائدہ پہنچا ہے۔انہوں نے قوم کے

مستقبل کے لئے اپنا آج کل کے لئے قربان کردیا۔اوراس وصف کے مدنظر، وہ تاریخ پاکستان کا ایک درخشاں باب متصور ہونگے۔آقائے رزم آرا (سابق وزیر اعظم ایران) قائداعظم اتحاد، یقین محکم اور تنظیم کے اصول کے مجسمہ تھے۔انہوں نے ملت پران تین صفات کی اہمیت واضح کی۔آپ ملت کے جذبہ عمل کے سرچشمہ تھے۔ان کی تعلیمات واضح محکم اوراصول پرمبنی تھیں۔آپ نے اپنے پیروؤں کوسیاست اورحکومت کے فن کی ایسی تربیت دی۔کہ ان کی وفات پر پاکستان کوضعف نہیں پہنچا۔مسز اینی بسنت۔جناح جیسی شخصیت بنی نوع انسان کی آزادی کے گلے کا ہار ہے۔جس کی یاد ہمیشہ تازہ رہے گی۔ڈاکٹرسی آرداس۔مسٹرجناح صرف مسلمانوں کی نجی دولت نہیں ہیں۔ بلکہ وہ سارے ہندوستان کے لئے سرمایہ افتخار ہیں۔لارڈ ایٹلی (سابق وزیراعظم برطانیہ) قائداعظم کا بے مثل جذبہ حریت اورشبانہ روزمحنت ہی وہ سرمایہ ہے جس نے پاکستان جیسے ملک کی بنیاد ڈلوائی۔نواب وقارالملک: قائداعظم محمد علی جناحؒ کسی بھی بے اصولی کو برداشت نہیں کرسکتے تھے۔بے اصولی ان کی چڑتھی۔اوراصول ان کی خوشنودی۔ہمیشہ ایسے لوگوں کو پسند کرتے تھے جواصول کے پابند ہوں خواہ ان کا تعلق کسی بھی طبقے سے کیوں نہ ہو۔سرراس مسعود۔وہ آزادی کی خاطرانگریزوں سے نبردآزما ہوئے۔وہ آزادی کی مہم میں کسی طرح بھی غاصبانہ اقدامات کو برداشت نہیں کرسکتے تھے۔مسلمانوں کی ذہنی معاشرتی، سیاسی اورثقافتی روایات کوکسی قیمت پرقربان کرنا انہیں گوارانہ تھا۔مولانا محمد علی جوہرؒ۔کاش خداوندعالم جج کے دل میں ڈال دے کہ مسلمانوں کی راہنمائی اب اس کے سوا کوئی نہ کرسکے گا۔نواب محمد یار جنگ۔قائد اعظم پاکستان کی روح رواں تھے۔ان کی تقریروں سے مسلمانوں کے بجھے ہوئے دلوں میں امید کی کرن پیدا ہوگئی۔ان کے پژمردہ دلوں پر امید کی کرنیں اور مسکراہٹیں رقصاں ہوگئیں اوراپنے دلوں میں ایک نیا عزم لئے جوق درجوق مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہوگئے۔جواس بات کا ثبوت ہے کہ عوام انہیں دل وجان سے چاہتے تھے۔حسین شہید سہروردی (وزیراعظم پاکستان) مسٹرجناح ان لوگوں میں سے ہیں جو ذاتی مقاصد کو لے کرآگے ہیں بڑھتے وہ بڑے دیانتدار اور راست گو ہیں۔وہ اپنا جواب آپ ہیں۔مولوی عبدالحق۔قائداعظم مرے نہیں۔وہ زندہ ہیں اور پاکستان کی شکل میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔سرعبدالقادر۔قائداعظم مرے نہیں۔جومشعل راہ انہوں نے فروزاں کی تھی بدستور فروزاں ہے وہ پاکستان کی شکل میں زندہ ہیں اورزندہ رہیں گے۔حکیم اجمل خان مسٹرجناح عملی طور پر وطن پرست ہیں۔اگرایک طرف ان کا وہ جوش اور ولولہ کہ ملک سیاسی طور پرآزاد ہوجائے اسے کسی کے سامنے سرنگوں ہونے نہیں دیتا تو دوسری طرف وہ سیاسی حالات سے بے خبرنہیں ہیں اوروہ ہرفرقے کے ساتھ انصاف چاہتے ہیں اوراسی بنیاد پرملک کی ساسی تعمیر کے متمنی ہیں۔علامہ عنایت اللہ المشرقی۔قائداعظم کا عزم پائندہ اورمحکم تھا۔وہ ایک جری اور بے باک سپاہی تھے۔جومخالفوں سے ٹکرانے کوئی باک محسوس نہیں کرتے تھے۔مولانا ابوالکلام آزاد۔قائداعظم بے جاجذباتیت کو پسندنہیں کرتے تھے۔وہ ہرمسئلے کا ٹھنڈے دل سے جائزہ لیتے تھے۔اوریہی ان کی کامیابی کا سب سے بڑا راز تھا۔شیخ عبداللہ۔قائداعظم کو اپنے مقصد میں جواس قدرمحیرالعقول کامیابی حاصل ہوئی۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک سچے مسلمان ہیں۔انہوں نے قوم کے مفاد کی حفاظت کا فریضہ تندرستی سے انجام دیا۔وہ ہمیشہ انصاف ودیانت کے مسلک پرکاربندرہے۔سلطان سرمحمد شاہ آغا خان۔مجھے اپنی زندگی میں بے شمار سیاستدانوں سے واسطہ پڑا۔لائیڈ جارج، چرچل، کرزن، مسولینی، گاندھی۔لیکن جناح ان سب میں منفرد تھے۔میرے خیال میں کوئی شخص بھی زیادہ مضبوط سیرت وکردار کا مالک نہ تھا ہوش و تدبر، عزیمت و استقامت جو سیست کا سنگ بنیاد ہیں جناح میں بدرجہ اتم ہیں۔چودھری رحمت علی۔قائداعظم کی شخصیت بہت ہی غیرمعمولی صفات کا مجموعہ تھی۔ وہ ایک فلسفی کی طرح سوچتے ایک منطقی کی طرح گفتگو کرتے اورایک ماہرقانون کی طرح پابند تھے۔مولانا حسرت موہانی۔جناح ایک لیڈر ہیں۔جومسلمانوں کوایک پلیٹ فارم پرلانے میں کامیاب ہوئے۔موصوف صحیح معنوں میں قائداعظم کہلانے کے حقدار ہیں۔ان کی تاریخ پیدائش وہی ہے۔جوانسانیت کے عظیم المرتبت نجات دہندہ حضرت عیسیٰ کی ہے۔اسی کی برکت ہے کہ وہ مسلمانان ہند کے سیاسی مسیحا ہیں۔سرسکندرحیات۔قائداعظم نے مسلمانوں کے لئے جوکچھ کیا ہے وہ انہیں صحیح معنوں میں قائداعظم کے لقب کا مستحق بناتا ہے۔ان کے بدترین ناقد بھی ان کی عظیم صلاحیت، اخلاص اوراحساس فرض کا اعتراف کئے بغیرنہیں رہ سکتے۔علامہ ڈاکٹرسرمحمد اقبال۔ہندوستان میں بحیثیت مسلمان آپ ہی کی واحد ہستی ہے جس سے ملت کو یہ توقع وابستہ کرنے کا حق ہے کہ شمالی مغربی یا شاید پورے ہندوستان میں جوسیلاب آرہا ہے اس میں آپ ملت کی صحیح راہنمائی فرمائیں گے۔محترمہ فاطمہ جناح۔قائداعظم گھریلو زندگی میں ہروقت ہنستے ہنسانے کے موڈ میں ہوتے باہرسخت طبیعت مگرحقیقت میں نرم طبیعت انسان تھے۔قائداعظم ایک ایسے صاحب بصیرت۔فرض شناس اور دیانت دارشخص تھے جن کا نام بطورمثال پیش کیا جاتا ہے۔تحریک پاکستان کے دوران مسلمانوں میں جوسیاسی تصورفکراسلامی اورجذبہ حریت کا طوفان اُمڈرہا تھا وہ قائداعظم کی جلیل اورعظیم ہستی کے طفیل تھا یہ قائداعظم کی قیادت کا ہی نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے ہندوؤں اوراگریزوں کی مشترکہ مخالفت کے باوجود پاکستان حاصل کیا۔قائداعظم کی دیانت کے معترف ان کے دوست تو کیا دشمن بھی تھے۔سروجنی نائیڈو (بلبل ہند) میں بڑی مدت سے محمد علی جناح کو چاہتی ہوں۔شروع شروع میں، میں نے ان کوروکا کہ سیاست ایک گندہ کھیل ہے، اس میں نہ کودیں، لیکن اب وہ سیاست کے سمندر میں کود پڑے ہیں تو میں ان کے لئے دعا گو ہوں۔کہ وہ کامیابی سے ہمکنار ہوں۔اوربھگوان انہیں سرخرو کردے۔آپ ایسے لیڈر ہیں۔جن کو نہ خریدا جاسکتا ہے اور نہ بددیانتی پرآمادہ کیا جاسکتا ہے۔مسٹرٹرومین (سابق صدر امریکہ)۔دولت

پاکستان کے معمار دنیا میں سب سے بڑی اسلامی مملکت کا بانی حق بات کہنے اور منوانے والا اب اس دنیا میں دوبارہ نہیں آئے گا۔ماسٹر تارا سنگھ۔قائد اعظم نے مسلمانوں کو ہندوؤں کی غلامی سے بچا لیا۔خان لیاقت علی خاں۔قائد اعظم نے واقعات کی رفتار اور زمانے کی روش کو اپنی غیر معمولی ذہانت اور لازوال قومی درد سے آشنا ہو کر اس کو تبدیل کرنے میں شب و روز محنت کی اور ایک منتشر قوم کو یکجا کرنے میں کامیابی حاصل کی۔سی راجگو پال اچاریہ۔قائد اعظم بلند پایہ شخصیت ہیں۔یہ کوئی معمولی انسان نہیں۔ملک میں زبردست مقبولیت کے مالک ہیں۔ان کی اندھی پیروی کی جارہی ہے۔یہی صحیح صحیح اور یہی سچی پیروی ہے۔وہ اپنی قوم کو بچانا چاہتے تھے۔وہ اس مقصد میں کامیاب ہو گئے اور انہوں نے ایک نئی مملکت قائم کر لی لارڈ رسل (فلاسفر)۔میں تمام زندگی میں جس شخص سے زیادہ متاثر ہوا ہوں وہ محمد علی جناح کی ذات ہے۔سر ہومی مودی۔مسٹر جناح مدتوں سے ہماری زندگی کے ایک مہتمم باالشان نمائندہ ہیں۔ان کی روش بظاہر مجموعہ اضداد رہ چکی ہے۔لیکن ہر تغیر کے ساتھ وہ ایک مستقل اور بنیادی اصول پر جمے رہے۔وہ نڈر ہیں۔بے خوف ہیں صاف گو ہیں شہرت کے طلب گار نہیں۔اور سیاسی سازشوں سے بالکل الگ تھلگ۔بہت کم ہیں جنہوں نے انہیں پہچانا،اور بہت کم ہیں۔جنہوں نے ان کے تنہائی کے قلعے میں رہائی پائی۔ایک شخصیت جو دلوں کو موہ لیتی ہے تم اس کو چاہے ناپسند کرو چاہے اسے بُرا کہو مگر اس سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔پی ایکس لارنس (انگریز صحافی) ان کا ہر ارادہ مسلمانوں کے لئے حرف آخری حیثیت رکھتا ہے۔ان کا حکم مسلمانوں کے لئے آخری فیصلہ ہے۔جس کی انتہائی خلوص کے ساتھ لفظ بلفظ تعمیل کی جاتی ہے۔

دیوان چمن لال (ایڈووکیٹ جنرل بمبئی ہائیکورٹ) جناح ان لوگوں میں سے ہے جو ذاتی مقاصد و اغراض کو پیش نظر رکھ کر نہیں بڑھتے۔ان کی دیانت پر کسی طرح حرف گیری نہیں کی جاسکتی۔وہ اپنی مثال آپ ہیں۔سر کاؤس جی جہانگیر۔جس راستہ کو وہ صداقت،حقانیت اور انصاف کا راستہ سمجھ لیتے ہیں۔اس سے کوئی چیز بھی انہیں منحرف نہیں کر سکتی۔وہ ہمت و استقلال کے دھنی ہیں۔میں جرات کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔کہ ان پر کسی بھی وقت کوئی موقع پرستی اور ابن الوقتی کا الزام نہیں لگا سکتا۔انہوں نے کبھی اپنی غرض اور اپنے مفاد کو ملکی مفاد پر ترجیح نہیں دی۔مسٹر جوکم الوا (ایڈیٹر فورم) جناح کی جرات اور بے ساختگی نے عدالتوں میں ان کی شخصیت کو ہی اجاگر کیا ہے ان کی مقناطیسی کا شہرہ ججوں سے بے خوف مقابلے اور عدالتوں میں بے لاگ قانونی موشگافیوں کے باعث دنیا بھر میں ہے۔جناح ہماری قانون دان برادری کا سب سے زیادہ باہمت انسان ہے۔کوئی منصف یا جج انہیں چکر دینے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ایف ای جیمز (سابق لیڈر یورپین گروپ سنٹرل لیجسلیٹو اسمبلی) سیاسی مجاہد کی حیثیت سے ہندوستان میں ان کا کوئی مدمقابل نہیں۔وہ عوام الناس کے بے خوف اور ناقابل تسخیر راہنما تھے۔مولوی فضل حق۔اعلیٰ کردار اور استقامت،قائد اعظم کے بڑے ہتھیار تھے۔ان کا دل اسلام اور مسلمانوں کی محبت سے معمور تھا۔سر سی پی راما سوامی آئر۔میں جناح کے واضح نظریات اور پبلک معاملات میں ان کی بھی بے غرضی اور بے لوثی کا معترف رہا ہوں۔انہوں نے عوام میں اپنی مقبولیت کو اپنی ذاتی فوائد کے لئے استعمال کرنے سے احتراز کیا ہے۔ڈاکٹر امبیدکر۔(اچھوت لیڈر) جناح صاحب کے بڑے بڑے دشمنوں کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔کہ وہ کسی بھی قیمت پر خریدے نہیں جاسکتے۔یہ اور بات ہے کہ مسٹر جناح اپنے ارادوں میں پختہ اپنی رائے میں سخت ہیں۔لیکن ین کے رویہ میں کبھی کوئی لوچ نہیں پایا جاتا۔جواہر لال نہرو۔(سابق بھارتی وزیر اعظم) میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔کہ محمد علی جناح کسی قیمت پر خریدے نہیں جاسکتے۔ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی۔اتنی بلند شخصیت تھے جتنی امام ابن تیمیہؒ تھے اس لئے کہ ابن تیمیہؒ نے مسلمانوں کو تاتاریوں سے بچایا۔جبکہ قائد اعظم نے مسلمانوں کو ہندوؤں کی چیرہ دستیوں سے محفوظ کیا۔گاندھی جی۔میں نے قائد اعظم کی تقریر سے اندازہ لگایا ہے کہ انہیں ہندوؤں سے کوئی پُرخاش نہیں ہے۔وہ ان کے ساتھ پُرامن زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔میں جانتا ہوں کہ آپ کو مسلم عوام پر بے نظیر قابو حاصل ہے۔آپ سیرت و کردار کی ان بلندیوں پر ہیں کہ کوئی لالچ،کوئی خوف اور کوئی طعنہ آپ کو اپنی رائے سے نہیں ہٹا سکتا۔لارڈ ماؤنٹ بیٹن۔راست بازی میں در یکتا،اندر باہر یکساں،انگریزی زبان کا درجہ اوّل مقرر،کمزور جسم و جاں کے ساتھ،بارُعب شخصیت،مسلمانان ہند کی اکیلے ناؤ کھینچنے والا اتنا بلند کردار اور قومی لیڈر شاید ہی مسلمانوں میں دوبارہ پیدا ہو۔سر ونسٹن چرچل۔(سابق برطانوی وزیر اعظم) قائد اعظم کو ایک بہترین سیاستدان اور دنیا کا ذہین و فطین لیڈر قرار دیا۔لارڈ کرپس۔مسٹر محمد علی جناح کے سینے میں شیر کا دل ہے۔ان کے ارادے اٹل ہیں۔وہ ضرور ہندوستان تقسیم کروائیں گے۔لارڈ ویول۔(سابق وائسرائے ہند) مسٹر جناح اپنے ارادوں میں اپنی رائے میں بے حد سخت ہیں۔ان کے رویے میں کوئی لچک نہیں پائی جاتی۔وہ مسلم قوم کے مخلص راہنما ہی نہیں بلکہ سچے وکیل بھی ہیں۔سر شاب موکھم چٹی (انڈین لیجسلیٹو اسمبلی) وہ بلاشبہ ایک بڑے وطن پرست پارلیمانی آداب کے ماہر اور ہندوستان کی زبردست شخصیت ہیں۔جنہیں کسی ترغیب یا تحریص سے گمراہ نہیں کیا جاسکتا۔اور نہ ان کی خودداری اور آزادی چھینی جاسکتی ہے۔ان کی زبردست سیاسی شخصیت کا راز اسی اہل اور غیر فانی روح آزادی میں پوشیدہ ہے۔وجے لکشمی پنڈت۔جناح ناقابل شکست تھے۔اگر مسلم لیگ کے پاس سو گاندھی ہوتے تو کانگرس کے پاس صرف ایک جناح ہوتا تو پاکستان کبھی نہ بنتا۔لارڈ لنسلتھگو۔مسٹر جناح کے تمام الفاظ ہیروں کی طرح قیمتی،ارادے چٹان کی طرح مضبوط وہ حقیقت میں ناقابل تسخیر ہیں۔نیلسن (جرنیل اور مدبر) مسٹر محمد علی جناح میں قدرت نے بے پناہ صلاحیتیں دی ہیں جب چاہیں جنگ کا رُخ تبدیل کر سکتے ہیں۔دس کروڑ انسان ان کے کہنے پر اپنی جان قربان کر سکتے ہیں۔

فیض احمد فیض

فکرِ دلدارئ گلزار کروں یا نہ کروں
ذکرِ مرغانِ گرفتار کروں یا نہ کروں
قصہ سازش اغیار کہوں یا نہ کہوں
شکوہء یار طرحدار کروں یا نہ کروں
جانے کیا وضع ہے اب رسمِ وفا کی اے دل
وضعِ دیرینہ پہ اسرار کروں یا نہ کروں
جانے کس رنگ میں تفسیر کریں اہلِ ہوس
شرحِ زلف و لب و رخسار کروں یا نہ کروں
یوں بہار آئی ہے امسال کے گلشن میں صبا
پوچھتی ہے گزر اس بار کروں یا نہ کروں
گویا اس سوچ میں ہے دل میں لہو بھر کے گلاب
دامن و جیب کو گلنار کروں یا نہ کروں

احمد ندیم قاسمی

تجھے کھو کر بھی تجھے پاؤں، جہاں تک دیکھوں
حسنِ یزداں سے تجھے حسنِ بتاں تک دیکھوں
تو نے یوں دیکھا ہے جیسے کبھی دیکھا ہی نہ تھا
میں تو دل میں ترے قدموں کے نشاں تک دیکھوں
فقط اس شوق میں پوچھی ہیں ہزاروں باتیں
میں ترا حسن ، ترے حسنِ بیاں تک دیکھوں
میرے ویرانہ جاں میں ترے غم کے دم سے
پھول کھلتے نظر آتے ہیں جہاں تک دیکھوں
دل گیا تھا تو یہ آنکھیں بھی کوئی لے جاتا
میں فقط ایک ہی تصویر کہاں تک دیکھوں
اک حقیقت سہی فردوس میں حوروں کا وجود
حسنِ انساں سے نمٹ لوں تو وہاں تک دیکھوں

سیف الدین سیف

واعظ بھی اس بت کو خدا مان رہا ہے
اس شہر میں اب کون مسلمان رہا ہے
میں چپ کہ ترا شکر ادا کر نہیں سکتا
تو میری خموشی کو گلہ جان رہا ہے
سایہ تھا تری زلف کا اک رات یہاں بھی
یہ بسترِ غم تختِ سلیمان رہا ہے
ہم کوئے ملامت سے گزر آ ئے ہیں یارو
اب چاک رہا ہے نہ گریبان رہا ہے
آتی ہے صدا پچھلے پہر سیف مرے سیف
دل اب تری آواز کو پہچان رہا ہے

قلندر مومند۔سپوت پاکستان

رانا عبدالرزاق خاں

آپ عربی، فارسی اور پشتو کے ممتاز عالم تھے اور ہندی، سنسکرت، عبرانی اور لاطینی کے علاوہ بنگلہ، انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور برصغیر کی مختلف دیگر زبانوں پر معقول حد تک عبور رکھتے تھے۔

پشاور پریس کلب کے بانی چیئرمین اور خیبر یونین آف جرنلسٹس کے سابق صدر قلندر مومند جن کا اصل نام صاحبزادہ حبیب الرحمٰن تھا پشاور کے ایک سرحدی گاؤں بازید خیل میں یکم ستمبر 1930ء میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد صاحبزادہ سیف الرحمٰن خان جو خود ایک اچھے شاعر اور دینی درس و تدریس سے وابستہ تھے اور جامع فتح پور بھارت سے فارغ التحصیل تھے کی وجہ سے آپ کے گھر کا ماحول علمی اور ادبی تھا جس کے سبب بچپن ہی سے لکھنے لگے تھے۔صرف بارہ سال کی عمر میں ایک ہفت روزہ ''الحق'' کے نام سے نکالنا شروع کیا جو درجنوں کی تعداد میں ایک دستی پریس پر خود شائع کرتے اور صوبے کے علاوہ ہندوستان میں بھی اس کے خریدار تھے۔حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد بھی ہفت روزہ ''الحق'' کے خریداروں میں شامل تھے۔آپ نے پشاور شہر میں خالصہ ہائی سکول میں تعلیم حاصل کی جس میں آج کل فرنٹیئر کالج فار ویمن قائم ہے میٹرک کے بعد اسلامیہ کالج میں داخل ہوئے۔۱۹۴۷ء میں ایف اے پاس کیا۔اُس زمانہ میں فارسی کا طوطی بولتا تھا۔اپنے اکابرین کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے آپ نے فارسی اور پشتو میں امتیازی نمبروں میں منشی فاضل کیا پھر ۱۹۵۷ء میں پشاور یونیورسٹی سے گریجوایشن کے بعد ایم اے انگلش کیا۔اور ۱۹۶۷ء میں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔اور جوان العمری میں ہی اشتراکی تحریک سے وابستہ ہوگئے ۔اور گورنمنٹ کالج پشاور ہی میں انگریزی کے لیکچرار مقرر ہوگئے لیکن بعد ازاں جلد ہی (1960ء میں) مارشل لاء کے دوران آپ کے سیاسی نظریات کی بدولت آپ کو ملازمت سے برخاست کر دیا گیا تھا۔ آپ نے 1973ء میں پشاور یونیورسٹی سے قانون (ایل ایل بی) کی ڈگری حاصل کی لیکن عملی طور پر قانون کے پیشہ سے وابستہ نہ ہوئے۔روزگار کے طور پر آپ نے صحافت کا رُخ کیا اور معروف انگریزی، اردو اخبارات خیبر میل (انگریزی)، انجام، بانگِ حرم، شہباز (اردو) اور پشتو جرائد (لار ښیا لے راہبر) کے عملہ میں شامل ہوکر خدمات انجام دیں۔اور ژوند کے نام سے ذاتی مجلّہ بھی نکالا۔سیاسی طور پر قلندر مومند پختون قوم پرست تحریک میں بھی نہایت سرگرم رہے اور خان عبدالغفار خان کے نہایت قریبی معتمد سمجھے جاتے تھے۔اپنے سیاسی نظریات کی خاطر انہیں متعدد بار قید و بند کی

صعوبتیں بھی جھیلنا پڑیں۔ایوب خان کے دور میں انہیں ایک سال تک شاہی قلعہ میں بھی قیدِ تنہائی میں رکھا گیا تھا۔جبکہ سیاسی نظریات کے باعث انہیں پنجاب پختونخواہ اور سندھ کی مختلف جیلوں میں بھی طویل عرصے تک قید رکھا گیا۔جب حیدرآباد سازش کیس میں نیشنل عوامی پارٹی کی ساری قیادت پر مقدمہ قائم کردیا گیا تھا تو قلندر مومند اس مقدمے میں خان عبدالولی خان اور ان کے دیگر ساتھیوں کے وکیل تھے۔قلندر مومند کو بیسویں صدی کے پشتو ادب میں ایک نابغہ کی حیثیت حاصل ہے۔پشتو زبان و ادب کے جدید دور پر ان کی شخصیت اور فن کے گہرے نقوش ثبت ہیں۔انہوں نے شاعری سے لے کر افسانہ نگاری، ڈرامہ نگاری، مضمون نویسی، انشاء پردازی، لغت نویسی، تحقیق، تنقید اور ترجمے تک میں نئی جہتیں متعارف کرائیں۔ان کی شائع شدہ کتابوں میں سباؤون اور رڑائی کے نام سے دو شعری مجموعے اور گجرے کے نام سے ایک افسانوں کا مجموعہ شامل ہے۔تحقیق میں رحمان بابا کی کلیات اور دیوانِ ابوالقاسم کی اشاعت ان کا نمایاں کارنامہ ہے جبکہ تنقید میں پٹہ خزانہ فی المیزان اور دخیر البیان تنقیدی مطالعہ ان کی معرکۃ الآرا تصانیف مانی جاتی ہیں۔''دریاب'' کے نام سے پشتو کی اولین جامع لغت کی تالیف کا سہرا بھی محترم قلندر مومند کے سر جاتا ہے۔انہوں نے پشتو رسم الخط میں بھی تبدیلیاں تجویز کیں۔اولسی ادبی جرگہ اور بعد ازاں دساھولیکونکیو مرکہ کے تحت پختون شعراء و ادباء کو فعالیت کی ترغیب و تحریک دینا اور ادب سے دل چسپی رکھنے والے نوجوانوں کی تربیت کے لئے پلیٹ فارمز کی فراہمی ان کا ایک اور نمایاں کارنامہ ہے۔آپ 1980ء میں گومل یونیورسٹی کے شعبہ قانون کے ساتھ بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر وابستہ ہوگئے اور جب اسے لاء کالج ڈیرہ اسماعیل خان کا درجہ دیا گیا تو آپ 1981ء میں اسکے پرنسپل مقرر ہوئے۔پشتو ادب کے شعبے میں آپ کی خدمات کے پیش نظر 1980ء میں آپ کو''صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی'' عطا کیا گیا اور 1989ء میں محترمہ بے نظیر بھٹو اقتدار میں آئیں تو بحالی جمہوریت کے لئے قلندر مومند کی خدمات کے اعتراف کے طور پر انہیں وزیراعظم کی طرف سے قومی ایوارڈ برائے بحالی جمہوریت سے نوازا۔آپ عربی، فارسی اور پشتو کے ممتاز عالم تھے اور ہندی، سنسکرت، عبرانی اور لاطینی کے علاوہ بنگلہ، انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور برصغیر کی مختلف دیگر زبانوں پر معقول حد تک عبور رکھتے تھے۔آپ کو 1982ء میں حکومت صوبہ سرحد نے ایک جامع پشتو لغت مرتب کرنے کے منصوبے کا سربراہ منتخب کیا۔آپ نے ابتداء میں (1982ء۔1991ء) اس منصوبے میں ڈائریکٹر کے طور پر اور پھر 1991ء کے بعد بطور مشیر خدمات انجام دیں۔آپ کے علم و فضل، محنت و مستقل مزاجی اور انتہائی کوششوں سے کی بدولت 1994ء میں''دریاب'' اشاعت پذیر ہوئی۔یہ پہلی یک لسانی (پشتو سے پشتو) جامع لغت ہے جس سے زبان کے رسم الخط اور الفاظ کے تلفظ کی معیار بندی کی توقع کی جاسکتی ہے۔یہ لغت صوتیات، الفاظ، ان کی اشتقاقیات، جامع معنی اور مترادفات، پودوں اور درختوں کے نباتاتی اور جانوروں کے حیواناتی ناموں جیسی بہت سی امتیازی خصوصیات کی حامل ہے۔1996ء میں ادب (تالیفِ لغت) کے شعبے میں نمایاں خدمات کے اعتراف میں صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان سردار فاروق احمد خان لغاری نے قلندر مومند کو''ستارہ امتیاز'' کا اعزاز عطا کیا۔آپ نے ایک طویل عرصے تک پشاور سے شائع ہونے والے اخبارات روزنامہ مشرق اور روزنامہ آج میں مستقل کالم نگاری کی۔آپ کے افسانوں کے تراجم دنیا کی متعدد زبانوں میں ہو چکے ہیں حال ہی میں پشاور یونیورسٹی میں آپ حیات و خدمات پر پی ایچ ڈی کا ایک مقالہ بھی لکھا گیا ہے۔(جالاوان مومند)۔قلندر مومند کا شمار صوبہ سرحد کے عظیم پشتون ادیبوں میں ہوتا ہے۔ابتدائی تعلیم بازید خیل میں ہی حاصل کی۔میٹرک پشاور سے پاس کیا۔۔زمانہ طالب علمی سے ہی قوم پرستی کا رجحان غالب تھا اور ساتھ ساتھ صحافت سے بھی والہانہ لگاؤ تھا۔آپ کا شمار پشتو ادب کے ترقی پسند لکھاریوں میں ہوتا ہے۔حق گوئی، نیک نیتی اصولوں پر عمل پیرائی سے آپ کی زندگی عبارت تھی۔منافقت، دقیانوسی، خوشامد آپ کی ذات سے کوسوں دور تھی۔جس بات کو حق جانا فوراً کہہ ڈالا۔آپ ایک لمبا عرصہ درس و تدریس سے منسلک رہے۔گورنمنٹ کالج پشاور، گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد میں بطور پروفیسر خدمات انجام دینے کے بعد گومل یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی سے وابستہ ہوگئے۔اورلاء کے شعبہ کے انچارج بھی رہے۔1982ء میں گورنمنٹ نے آپ کو''پشتو ڈکشنری'' منصوبہ کا ڈائریکٹر مقرر کردیا۔آپ کی شب و روز کی محنت سے 70 ہزار الفاظ پر مشتمل ''پشتو ڈکشنری'' 1991 میں شائع ہوئی۔قلندر مومند کا شمار بیسویں صدی میں پشتو کے بہترین ادیبوں میں ہوتا ہے۔ہم عصر ادیبوں نے قلندر مومند کی خدمات کے اعتراف میں ان کو بیسویں صدی کا'' بایزید'' کا خطاب دیا ہے۔آپ درجن بھر کُتب کے مصنف تھے۔آپ 4 فروری 2003 کو پشاور میں فوت ہوئے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را۔

پروین شاکر

تراش کر مرے بازو اُڑان چھوڑ گیا
ہوا کے پاس برہنہ کمان چھوڑ گیا
رفاقتوں کا مری، اُس کو دھیان کتنا تھا
زمین لے لی مگر آسمان چھوڑ گیا
عجیب شخص تھا، بارش کا رنگ دیکھ کے بھی
کھلے دریچے یہ اِک پھول دان چھوڑ گیا
جو بادلوں سے بھی مجھ کو چھپائے رکھتا تھا
بڑھی ہے دھوپ تو بے سائبان چھوڑ گیا
نکل گیا کہیں ان دیکھے پانیوں کی طرف
زمین کے نام کھلا بادبان چھوڑ گیا

عقب میں گہرا سمندر ہے،سامنے جنگل
کس انتہا پہ مرا مہربان چھوڑ گیا

شاہدہ حسن

چھوٹی چھوٹی رنجش پر کنبہ بٹ جاتا ہے
ایسی باتیں ہوتی ہیں بس دل کٹ جاتا ہے
اُجلا اُجلا رکھتی ہوں ہر چیز کو میں پھر بھی
اکثر مٹی میں یہ سارا گھر لُٹ جاتا ہے
یادوں کی آندھی کا کیا ہے جب بھی آتی ہے
اتنے پتے جھڑتے ہیں رستہ پٹ جاتا ہے
شام کا منظر اک آسیب کا سایہ لگتا ہے
پیڑوں کے پیچھے سے جب سورج ہٹ جاتا ہے
آدھا تن کھو بیٹھی میں بھی غم کی شدت میں
دھوپ میں چلنے والوں کا سایہ گھٹ جاتا ہے
اپنے دادا پر ہی گیا میرا بیٹا بھی
پہلے سچ کہتا ہے پھر اس پر ڈٹ جاتا ہے

چوہدری محمد ادریس ایم اے، جارجیا امریکہ

منٹو کی زندگی اور ادبی کاموں پر نئی سوانح عمری

چند برس قبل آتش تاثیر نے منٹو کے منتخب افسانوں کا نیا انگریزی ترجمہ زیور طباعت سے آراستہ کیا تھا۔ اب منٹو کی پوتی عائشہ جلال جو امریکن یو نیورسٹی TUFT میں ریزیڈنٹ سکالر ہے نے ہندوستان اور پاکستان سے دستیاب ہونیوالے خطوط اور اس کی کتب کے اصل مسودات پر مبنی سوانح عمری شائع کی ہے۔ منٹو کی زندگی کے آخری مہ وسال پاکستان میں گزرے تھے۔ عائشہ جلال کے الفاظ میں جو کچھ پیش نظر ہے ایک کینوس کی طرح ہے جس پر منٹو کی زندگی کا ہمدردی اور جذبات ابھارنیوالا سٹائیل اجاگر ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ تحت الشعور بٹوارے کی ہولنا کی سے مربوط ہوتا ہے۔

فاطمہ حسن

اُڑتے ہوئے پرند کی تصویر دیکھ کر
دیکھا ہے میں نے خواب یہ تعبیر دیکھ کر
گر خوف بھی نہیں ہے تو کیوں رُک گئے ہیں لوگ
آئے تھے جو کھلی ہوئی زنجیر دیکھ کر
اب گُھل گیا ہے لہو میں تو انجام کچھ بھی ہو
کیا مل سکے گا زہر کی تاثیر دیکھ کر
میرے سوا بھی اس کو کئی کام ہیں یہاں

تمام قارئین

قندیلِ ادب

کی خدمت میں

ادارے کی طرف سے

رمضان مبارک ہو۔

The Pity of Partition: Manto's Life, Times and Works across India-Pakistan (Princeton University Press). By Ayesha Jalal

اگرچہ سعادت حسن منٹو کا ذکر کبھی بھی بالائے طاق نہ رکھا گیا تھا پھر بھی گزشتہ برس اس کی صد سالہ برسی نے اس ادبی دیوقامت انسان میں دلچسپی کو از سرنو تازہ کر دیا۔ اسے بیسویں صدی کا عظیم ترین اردو افسانہ نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس نے اپنے کلاسیکل افسانوں جیسے بٹوارے (۱۹۴۷ء) کی جذباتی ٹھیس کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ خصوصاً اس کے افسانوں ٹوبہ ٹیک سنگھ، کھول دو، اور ٹھنڈا گوشت کا شمار اس ضمن میں ہوتا ہے۔ منٹو کیلئے جگر کی بیماری Cirrhoses جان لیوا ثابت ہوئی۔ کتنی حیرت زدہ بات ہے کہ بوقت وفات اس کی عمر صرف ۴۲ سال تھی۔ اس کے باوجود اس کے دو درجن کے قریب افسانوی مجموعے، ایک ناول، ریڈیائی ڈرامے اور مضامین کو یاد داشت سے محو نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی حیرت انگیز تخلیقات میں اس وقت کی نو خیز فلم انڈسٹری کی سکرین سکرپٹس بھی شامل ہیں۔

سمجھی مگر یہ بات میں تاخیر دیکھ کر
بین السطور اس نے نہ جانے پڑھا ہے کیا
خاموش ہو گیا مری تحریر دیکھ کر

سعداللہ شاہ

اُس نے بس اتنا کہا، میں نے سوچا کچھ نہیں
میں وہیں پتھرا گیا، میں نے سوچا کچھ نہیں
کون ہے، کیسا ہیوہ، مجھ کو اس سے کیا غرض
وہ مجھے اچھا لگا، میں نے سوچا کچھ نہیں
میں بھی تو انسان تھا، ایک خامی رہ گئی
میں نے جس کو دل دیا، میں نے سوچا کچھ نہیں
اس کی خاطر سوچنا، سوچنا بھی رات دن
پھر بھی مجھ کو یوں لگا، میں نے سوچا کچھ نہیں
اس سے میں نے کیا کہا، یہ تو ہے اک واقعہ
یہ بھی ہے اک واقعہ، میں نے سوچا کچھ نہیں
نفرتیں تھیں سعدؔ جی چاہتوں کے درمیاں
چاہتوں میں کیا ہوا، میں نے سوچا کچھ نہیں

صائمہ علی

اب دوستوں سے ہے نہ تری بے رُخی سے ہے
جو بھی گلہ ہے اپنی ہی سادہ دلی سے ہے
کیسے کٹے گی رات بتانا تو شامِ ہجر
اک دردِ بے پناہ تو تو دل میں ابھی سے ہے
تیری خوشی ہیں گر مری بے چینیاں تو کیا
میرا سکونِ دل بھی تو تیری خوشی سے ہے
میں اُس سے ہم کلام ہوں اور وہ ہے بے نیاز
جیسے مرا خطاب کسی اجنبی سے ہے
پھر کس لئے بچاؤں پھٹی اوڑھنی کو میں!
جب تو ہی مطمئن مری بے چادری سے ہے

سیمیںؔ برلاس کے شعری مجموعے ''بحرِ خیال'' کے متعلق مختلف اہلِ ادب کی آراء۔

جناب محسن احسان (پرائڈ آف پرفامنس حکومتِ پاکستان) لکھتے ہیں:۔

سیمیںؔ برلاس ''بحرِ خیال'' کی وہ شناور ہیں جس کے چاروں اطراف بڑے بڑے نہنگ تیر رہے ہیں۔ قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ ادب کے اس بے پایاں سمندر میں سیمیںؔ بڑے اعتماد سے اُتری ہیں اگر اس نے اسی ہمت اور جرات سے کوشش جاری رکھی تو دوسرے کنارے تک رسائی اس کے لئے مشکل نہیں ہوگی۔ اس کے کلام میں خلوص کی چاشنی اور فکر کی تازگی اس بات کی آئینہ دار ہیں کہ وہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ اس کے تخلیقی خمیر میں اپنی مٹی سے وابستگی شدید ہے۔ جذبہ اور خیال کی ہم آہنگی گواہی دیتی ہے کہ فن کے ساتھ اس کی دلچسپی قائم و دائم رہے گی۔

خالد یوسف آکسفورڈ رقم طراز ہیں:۔

گزشتہ کئی برس سے برطانیہ کی مختلف ادبی تقاریب میں سیمیںؔ کا کلام سننے کا موقع ملا۔ ان کا اندازِ سخن فرسودہ روّیوں کی پیروی نہیں کرتا۔ بلکہ وہ بڑے شگفتہ اور جاندار لہجے میں اپنے مافی الضمیر کو شعری قالب میں ڈھالنے پر قدرت رکھتی ہیں۔ ان کے اشعار سُن کر ایک گونہ تازگی کا احساس ہوتا ہے اور ان کا لب و لہجہ فکر و ادراک کے نئے دریچے کھول دیتا ہے یہ سن کر کہ وہ اپنا مجموعہ کلام منظرِ عام پر لانے کا ارادہ کر رہی ہیں بے حد مسرت ہوئی ہماری نیک تمنائیں اُن کے ساتھ ہیں۔

اکبر حیدر آبادی تحریر کرتے ہیں:۔

سیمیںؔ ایک سنجیدہ مزاج اور نرم و نازک نسوانی لہجہ کی شاعرہ ہیں۔ ان کے کلام میں فکر و خیال اور اسلوبِ بیان کی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ سیمیںؔ نے شاعری کی دونوں اصناف میں جی کھول کر طبع آزمائی کی ہے اور دونوں میں اپنے جوہرِ طبع کا بڑی خوبصورتی سے مظاہرہ کیا ہے۔ یہ بات نہ صرف خود سیمیںؔ برلاس کے لئے بلکہ تمام دلدادگانِ شعر و ادب کے لئے فال نیک ہے۔ کہ اب اُن کا دوسرا شعری مجموعہ ''بحرِ خیال'' زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آ رہا ہے۔ مجھے قوی امید ہے کہ ان کے پہلے مجموعہ کلام کی طرح اس کتاب کو بھی ادبی حلقوں میں خاطر خواہ مقبولیت اور پذیرائی حاصل ہوگی۔

صفدر ہمدانی لندن سے فرماتے ہیں:۔

سیمیںؔ برلاس کو میں نے فقط دو تین مشاعروں میں سنا ہے۔ اور مجھے خوشی ہے کہ وہ اپنا کہا ہوا شعر بہت خوبصورت ادائیگی کے ساتھ پیش کرتی ہیں اور انہیں شعر پڑھتے ہوئے بھی علم ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ شعر کیسے کہا ہے۔ وہ اپنے مزاج اور ظاہری شکل و صورت سے جیسی نظر آتی ہیں ان کی شخصیت کا یہی عکس ان کی غزلوں کے کئی شعروں اور نظموں میں نظر آتا ہے۔

تنویر اختر مدیر ساحل لکھتے ہیں:۔

سیمیںؔ برلاس کا کلام انکی فلسفیانہ سوچ کی غمازی کرتا ہے۔ ان کے خیالات صوفیانہ اور کلام عارفانہ ہے وہ دنیا میں بھائی چارے اور امن کی خواہاں ہیں۔ غربت مٹانے کی تڑپ رکھتی ہیں اگر دبے دبے الفاظ میں مالک سے شکوہ بھی کریں۔ تو بھی اسکی رحمت پر بھروسہ رکھے ہوئے ہیں۔ ان کے اندر جو درد چھپا ہے اس کا اظہار بہت بے ساختگی سے کر دیتی ہیں۔ ان کی شاعری میں زندگی کے کئی موڈ ہیں۔ جو آپ کو بحرِ خیال میں نظر آئیں گے۔

عقیل دانش رقم طراز ہیں:۔

سیمیںؔ صاف، شگفتہ، سلیس اور رواں زبان میں اپنی بات کہتی ہیں ان کی شاعری میں پہاڑوں ہیبت نہیں بلکہ چشموں کا ترنم ہے۔ان کی ہر غزل، ہر نظم پڑھنے والے پر ایک تاثر چھوڑتی ہے۔یہی ان کی شاعری کا کمال ہے۔برطانیہ کی شعری محفلوں کو وہ کئی سال سے اپنی شاعری سے گرما رہی ہیں۔ان کی شرکت ہر محفلِ سخن کی کامیابی کی ضمانت ہے۔

سیمیںؔ برلاس

ہم یوں ہی اگر بر سرِ پیکار رہیں گے
خطرے میں سبھی زیست کے آثار رہیں گے
ہوگی نہ اگر صاف دلوں کی یہ کدورت
آئین یہ سمجھوتوں کے بے کار رہیں گے
دل میں نہ پنپ پائے گا پھر جذبہ اُلفت
گر ہاتھ میں ہم لوگوں کے ہتھیار رہیں گے
جب تک نہیں چھوڑیں گے ہم آپس کی یہ تفریق
ہم دوسری قوموں میں یونہی خوار رہیں گے
کب تک نہیں ہوگی تجھے پہچان خدا کی
کب تک ترے کوچے میں یوں اغیار رہیں گے
آزاد سمجھتے ہیں جو ہر ربط سے خود کو
خود اپنی ہوس کے وہ گرفتار رہیں گے
سیمیںؔ تجھے کل بھول جائیں گے اگر لوگ
لوگوں کی زباں پر ترے اشعار رہیں گے

ہنسنا بھی ضروری ہے

☆ایک اخبار کے ایڈیٹر نے سب ایڈیٹر سے کہا ''تم نے یہ کیا سرخی لگائی ہے بیوی میں دھماکہ''۔''جناب میں نے خبر کو آسان الفاظ میں لکھا ہے''سب ایڈیٹر نے مودب لہجے میں جواب دیا۔''خبر کے اصل الفاظ کیا ہیں''۔ایڈیٹر نے پوچھا۔''میانوالی میں دھماکہ''سب ایڈیٹر نے جواب دیا۔☆صحت کے لئے ہنسنا ضروری ہے مگر کسی پہلوان کے سامنے نہیں۔☆ایک بحری جہاز کے ڈوبنے کا خطرہ تھا۔پائلٹ نے مسافروں سے کہا''اگر آپ میں سے کسی کو ڈوبنے سے بچنے کی دعا آتی ہے تو وہ ہاتھ اٹھا لے''۔ایک شخص نے ہاتھ کھڑا کیا۔پائلٹ نے کہا''آپ دعا پر ہی گزارہ کریں ہمارے پاس ایک لائف جیکٹ کم ہے۔☆ایک دفعہ برطانوی وزیراعظم ایک پاگل خانے کے دورے پر گئے۔جیسے ہی مرکزی دروازے سے اندر جانے لگے تو ایک پاگل صحت مند ہونے کے بعد گھر جانے کے لئے باہر نکل رہا تھا۔ان صاحب کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے چرچل نے کہا۔''مجھ سے ملو میں برطانیہ کا وزیراعظم ہوں''۔ان صاحب نے چرچل سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا''فکر نہ کرو جلدی ہی ٹھیک ہو جاؤ گے میں جب یہاں آیا تھا تو میں بھی یہی کہتا تھا۔☆ایک شخص کا جوتا بڑا ہونے کی وجہ سے چلتے میں آواز کر رہا تھا۔ایک دوسرے شخص نے ازراہ مذاق کہا۔کیوں بھئی کیا جوتا چوری کا ہے جو آواز کر رہا ہے۔''وہ صاحب جھنجھلا کر کہنے لگے۔نہیں تو اگر ایسا ہوتو یہ میری شرٹ اور ٹائی بھی آواز کرتیں''۔☆ایک آدمی (راہ گیر سے) ہسپتال کون سی سڑک جاتی ہے؟۔راہ گیر'' آپ سڑک پر لیٹ جائیں خود بخود ہسپتال پہنچ جائیں گے''۔☆ایک خاتون نے دو میل پیدل چل کر نے کا ریکارڈ قائم کیا۔شاپنگ کے نام پر چلی ہوں گی۔۱۔وہ اس خیال سے چڑیا گھر نہیں جاتا کہ چڑیا گھر والے اسے باہر نہیں آنے دیں گے۔۲۔میری بیوی کی خواہش تھی کہ وہ دنیا دیکھے چنانچہ میں نے اسے ورلڈ اٹلس خرید دی۔۳۔وہ بڑا محتاط ڈرائیور ہے خوب دیکھ بھال کر لال بتی کراس کرتا ہے۔۴۔مجھے کام سے محبت ہے میں دفتر میں لوگوں کو کام کرتے دیکھ کر خوش ہوتا رہتا ہوں۔۵۔سخت دھند کی وجہ سے میں یہ بھی نہ دیکھ سکا کہ موسم کیسا ہے ۶۔یہ واٹر پروف گھڑی ہے جناب! پانی کا جو قطرہ ایک بار اس کے اندر جائے گا کبھی باہر نہیں آسکے گا۔۷۔اس نے مجھے ڈانٹا کہ میں گلاس میں گندہ پانی لے آیا ہوں حالانکہ پانی صاف تھا گلاس میلا تھا۔۸۔دنیا کی کوئی گھڑی وقت نہیں بتاتی خود دیکھنا پڑتا ہے ۹۔صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے لیکن اس کا زیادہ استعمال ذیابیطس بھی کر دیتا ہے ۱۰۔یہ شخص فرشتہ ہے لیکن انسانی صفات سے عاری ہے ۱۱۔آپ نے پوچھا ہے کہ مجھے آپکا بھیجا ہوا چیک مل گیا ہے کہ نہیں جواباً عرض ہے کہ ایک بار نہیں بلکہ دو بار ملا ہے۔ایک بار آپکی طرف سے ایک بار بنک کی طرف سے۔۱۲۔میں اس ڈرائیور کے ہاتھوں چھ بار مرتے مرتے بچا ہوں اور اب یہ کہتا ہے کہ مجھے ایک موقع اور دیں۔

مسلمان

ایسی بخشش کا سامان ہوا پھرتا ہے
شہر سارا ہی پریشان ہوا پھرتا ہے
ایک بارود کی جیکٹ اور نعرہ تکبیر
راستہ خُلد کا آسان ہوا پھرتا ہے
کیا عاشق ہے تیرے نام پہ قرباں ہے مگر
تیری ہر بات سے انجان ہوا پھرتا ہے
ہم کو جکڑا ہے جبر کی زنجیروں نے
اب تو یہ شہر ہی زندان ہوا پھرتا ہے
جانے کب کون ماردے کافر کہہ کر
شہر کا شہر مسلمان ہوا پھرتا ہے

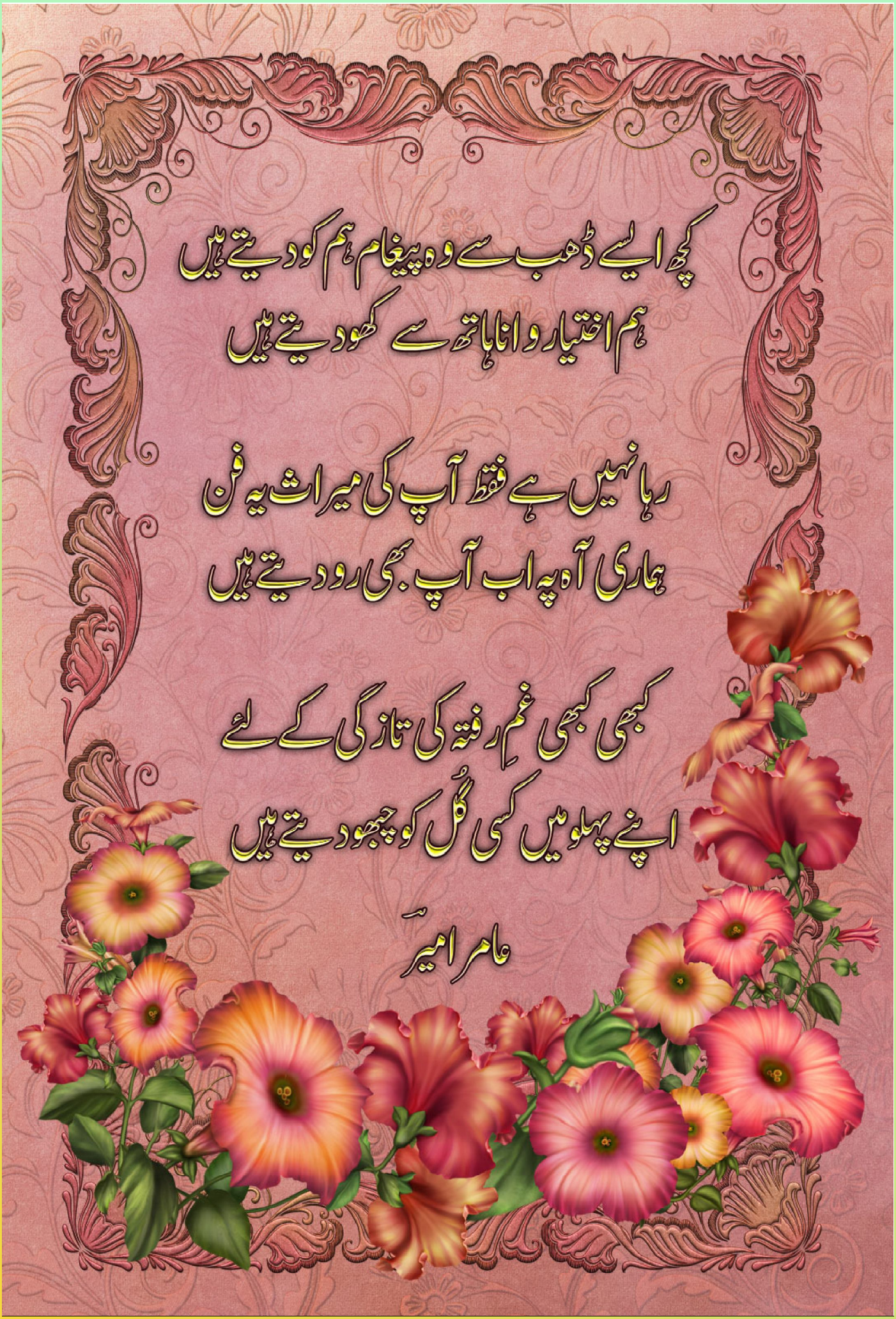
کچھ ایسے ڈھب سے وہ پیغام ہم کو دیتے ہیں
ہم اختیار و انا ہاتھ سے کھو دیتے ہیں
رہا نہیں ہے فقط آپ کی میراث یہ فن
ہماری آہ پہ اب آپ بھی رو دیتے ہیں
کبھی کبھی غمِ رفتہ کی تازگی کے لئے
اپنے پہلو میں کسی گُل کو چبھو دیتے ہیں
عامر امیرؔ